قیمت: پانچ روپے

ملی ٹائمز انٹرنیشنل

نئی دہلی

اردو کا پہلا بین الاقوامی ہفت روزہ

اس شمارے میں

ہندوستانی معاشرہ پر

فحش رسائل کی یلغار
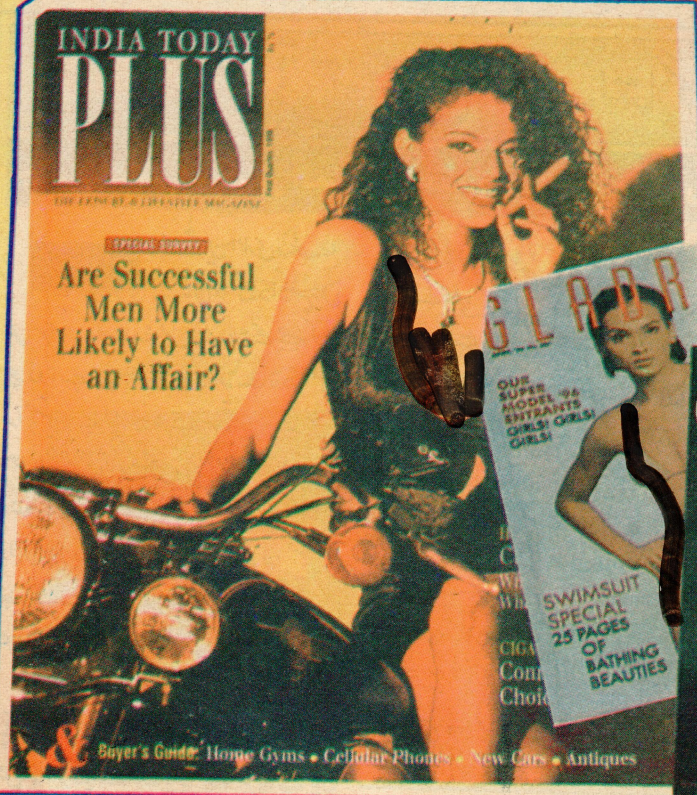
Country	Price	Country	Price	Country	Price	Country	Price	Country	Price
AUSTRALIA	A$ 3.50	DENMARK	D. KR. 14.00	ITALY	LIT. 3,000	NEW ZEALAND	NZ$ 4.95	SRI LANKA	Rs 40
BANGLADESH	Taka 20	FRANCE	Fr 10	JAPAN		NORWAY	N. KR 12.00	SWEDEN	Kr 15
BELGIUM	Fr 70	FINLAND	F. MK 10.00	KOREA	W 1.800	PAKISTAN	Rs. 15	SWITZERLAND	Fr 3
BRUNEI	B$ 4.50	GERMANY	DM3.50	MALAYSIA	RM 3.00	PHILIPPINES	P 25	THAILAND	B 40
CANADA	C$.3.50	HONG KONG	HK$ 15.00	MALDIVES	Rf 12.00	SAUDI ARABIA	SR 3	U.K.	60p.
CHINA	RMB 12.50	INDONESIA	RP 3,400 (INC.PNN)	NETHERLANDS	G 3.30	SINGAPORE	S$ 2.50	U.S.A.	$1.25

"فوجیوں نے ہمیں مار مار کر ووٹ دینے پر مجبور کیا"

کشمیر میں پرامن انتخابات کے سرکاری دعوے کی قلعی کھولنے والی ایک چشم کشا رپورٹ

رپورٹ : سبینہ اندر جیت

نہ تشدد

"نہ دھاندلی اور نہ ہی بوتھوں پر قبضہ عوام خود بخود آئے، بڑی تعداد میں آئے اور ووٹ دیا۔" یہ تو ریاستی حکومت کا بیان تھا۔ جبکہ کشمیریوں کی زبان پر ایک ہی بات تھی۔ "ہمیں دھمکی دی گئی، ہمیں ہمارے گھروں سے نکال کر باہر لایا گیا اور فوج نے ہمیں ووٹ دینے پر مجبور کیا۔"

ان دعووں اور جوابی دعووں کے درمیان اور بے مثال سیکورٹی کے تحت اننت ناگ اور بارہ مولہ پارلیمانی حلقوں میں انتخاب منعقد کیا گیا تھا۔ یونیفارم پہنے ہوئے آدمی ان ضلعوں میں ہر طرف پھیلے ہوئے دیکھے جاسکتے تھے جب اخبار نویس گاؤوں اور قصبات میں سفر کررہے تھے۔

تاہم ریاستی حکومت نے انتخابی عمل میں سیکورٹی کے عملے کے ملوث ہونے کی خبر کی تردید کی۔ وہ یہی کہتی رہی کہ "تشدد کا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا، نہ دھاندلی ہوئی اور نہ بوتھوں پر قبضہ اور کسی امیدوار کی طرف سے کوئی شکایت بھی درج نہیں ہوئی۔" ریاستی حکومت کے بقول فوج صرف انتخاب کے لیے ایک ماحول کو یقینی بنانے ہوئے تھی۔

دن شروع ہوا تو آسمان پر بادل تھے اور ہلکی سی بارش بھی ہوئی۔ سات بجے ریاستی دارالحکومت کی سڑکوں پر کوئی بھی شخص عام لباس پہنے ہوئے یا کوئی شہری نظر نہیں آرہا تھا۔ ہمیں

☆ ووٹ دینے کے لئے لوگوں کی قطار —— کیا یہ لوگ اپنی مرضی سے آئے ہیں

ایک چیک پوائنٹ پر رکنا پڑا۔ جہاں رپورٹروں سے اس گاڑی سے اترنے کو کہا گیا جس میں وہ سفر کررہے تھے۔ یہ ایک ایم ڈی سی پی ہے یعنی یہاں گاڑیاں چیک کی جاتی ہیں کہ کہیں ان میں ہتھیار اور بارود تو نہیں ہے۔ ایک فوجی نے یہ وضاحت کی۔ لیکن اسی اثناء میں ایک سرکاری گاڑی جس میں اخبار والے سوار تھے، زوں سے نکل گئی اور وہاں موجود فوجیوں نے اسے روکا تک نہیں۔

> ایک پولنگ بوتھ اسلامیہ ہائی اسکول میں تھا۔ ایک چھوٹے سے کلاس روم میں پانچ افسر تھے۔ ووٹر اندر آتے، اپنا نام بتاکر ایک بیلٹ پیپر لیتے۔ اس کے بعد وہ دو قدم چل کر ایک میز پر جاتے اور بیلٹ پیپر پر مہر لگادیتے۔ ساتھ ہی ایک دوسرے کمرے میں پولنگ افسر اسی میز کے پاس بیٹھا ہوا تھا جس پر ووٹر اپنا ووٹ دے رہے تھے۔ وہ لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ وہ کہاں مہر لگائیں۔

یہاں سے بیس کلومیٹر کی دوری پر ایک پولنگ اسٹیشن ملا جہاں بالکل سناٹا تھا۔ کوئی بھی شہری وہاں نہیں تھا۔ صرف سیکورٹی افواج کا ایک عملہ تھا۔ "ابھی بہت سویرا ہے۔ (صبح کے آٹھ بجے تھے) کشمیری ابھی اٹھیں گے اور آپ انہیں اس جگہ بھیڑ لگاتے ہوئے دیکھیں گے۔" یہ ایک فوجی افسر نے کہا۔

تھوڑا اور آگے گئے تو لوگوں کی ایک بھیڑ شاہراہ پر جارہی تھی اور فوجی جوان ان پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔ یہ ایک پولنگ اسٹیشن کی طرف جارہے تھے۔ پوچھنے پر انہوں نے اننت ناگ ضلع کے بتیاوار گاؤں کے لوگوں نے الزام لگایا کہ "فوج پانچ بجے آئی اور ہمیں دھمکی دی کہ اگر ہم نے ووٹ نہیں دیا تو ہمیں قتل کردیا جائے گا اور ہمارے مکانات میں آگ لگادی جائے گی۔" جس شخص سے بھی اس نامہ نگار نے ملاقات کی، اس نے یہی بات کہی۔

یہی معاملہ بیج بہارا، پوم پور اور پلواما میں بھی تھا۔ ایک دوسرے گروپ میں سے ایک شخص نے کہا کہ "مقامی مسجد سے اعلان ہوا کہ ہمیں باہر جانا اور ووٹ دینا ہے۔ یہ بھیڑ جارحانہ موڈ میں تھی۔ لیکن بعض جگہوں پر بے دلی کا منظر تھا۔ ایک

> بارہ مولہ شہر میں ایک بھیڑ کو منتشر کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ کی گئی اور آنسو آور گولے داغے گئے۔ یہ بھیڑ تاشقند چوک کی طرف جارہی تھی۔ ان کا احتجاج تھا کہ فوج انہیں مار مار کر ووٹ دینے پر مجبور کررہی ہے۔

سینیئر شہری نے کہا کہ "آپ سے کیا بتائیں کہ یہاں کیا ہوا، جھوٹ یا سچ، کیا یہ کوئی معنی رکھتا ہے۔"

لیکن ساتھ چل رہے فوجیوں نے ان سارے الزامات کی تردید کی۔ "یہ (عوام) ووٹ دینا چاہتے ہیں۔ ہم نے صرف یہ گذارش کی ہے کہ اپنے ووٹ کو ضائع نہ کریں۔" انہوں نے ہمیں کہا کہ وہ یہ کہیں گے کہ "ہمیں ووٹ دینے کے لیے مجبور کیا جارہا ہے" اس طرح وہ جنگجوؤں کا نشانہ نہیں

> اننت ناگ ضلع کے بتیاوار گاؤں کے لوگوں نے الزام لگایا کہ "فوج پانچ بجے آئی اور ہمیں دھمکی دی کہ اگر ہم نے ووٹ نہیں دیا تو ہمیں قتل کردیا جائے گا اور ہمارے مکانات میں آگ لگادی جائے گی۔ جس شخص سے بھی اس نامہ نگار نے ملاقات کی، اس نے یہی بات کہی

بنیں گے۔" یہ بات ہر فوجی کہتا تھا۔

بیج بہارا اور اننت ناگ میں پولنگ بوتھوں پر دورے کرنے پر یہ تضادات دیکھنے کو ملے۔ پہلے پولنگ بوتھ پر بھیڑ تھی۔ بیج بہارا میں ایک پولنگ بوتھ اسلامیہ ہائی اسکول میں تھا۔ ایک چھوٹے سے کلاس روم میں پانچ افسر تھے۔ ووٹر اندر آتے، اپنا نام بتاکر ایک بیلٹ پیپر لیتے۔ اس کے بعد وہ دو قدم چل کر ایک میز پر جاتے اور بیلٹ پیپر پر مہر لگادیتے۔ ساتھ ہی کے ایک دوسرے کمرے میں پولنگ افسر اسی میز کے پاس بیٹھا ہوا تھا جس پر ووٹر اپنا ووٹ دے رہے تھے۔ وہ لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ وہ کہاں مہر لگائیں۔ جب اس نامہ نگار نے صدر افسر کی اس طرف توجہ دلائی تو اس نے کچھ کہا نہیں لیکن اس افسر کو اشارہ کیا کہ وہ ہٹ جائے۔

اننت ناگ شہر میں ایک پولنگ بوتھ پر چند لوگ تھے۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ نوجوانوں کے ایک گروپ نے کہا کہ یہاں چند ہی افراد باہر آنے کی زحمت کریں گے۔

بارہ مولہ میں گاؤں والے اور سیکورٹی فورس والے تعداد میں برابر تھے۔ لمبے سفر کی یکسانیت وقفے وقفے سے پولنگ بوتھوں پر جمع بھیڑ سے ختم ہوتی تھی۔ ڈیلینا مقام پر بھیڑ اس نامہ نگار کی کار کی طرف بڑھ آئی اور وہی دہرایا کہ کس طرح انہیں ووٹ دینے پر مجبور کیا گیا ہے۔ ایک عمارت کے باہر، جہاں سیکورٹی افواج کا ایک مختصر عملہ نگرانی پر تھا، ایک افسر یونیفارم میں بیٹھا تھا جس کے ہاتھ میں ووٹروں کی ایک لسٹ تھی اور وہ ان ووٹروں کو چٹیں دے رہا تھا جن کا الزام تھا کہ انہیں زبردستی لایا گیا ہے۔ یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس افسر کا تعلق سی آر پی ایف سے تھا یا فوج سے۔ بہرحال وہ یونیفارم میں تھا اور لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ ایک فوجی افسر تھا۔

بارہ مولہ شہر میں ایک بھیڑ کو منتشر کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ کی گئی اور آنسو آور گولے داغے گئے۔ یہ بھیڑ تاشقند چوک کی طرف جارہی تھی۔ ان کا احتجاج تھا کہ فوج انہیں مار مار کر ووٹ دینے پر مجبور کررہی ہے۔

سوپور میں آدمیوں، عورتوں اور بچوں کا ایک گروپ سڑک پر بیٹھا ہوا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے اخبار نویسوں اور کیمرہ والوں کو دیکھا تو وہ نعرے لگانے لگے اور ہاتھ پیر طرح طرح سے بنانے لگے۔ ایک مقام پر اس نامہ نگار سے اچانک سیکورٹی فورس نے یہ درخواست کی کہ وہ فوراً واپس چلا جائے "کیونکہ لوگ اخبار نویسوں کو اغوا کرنے کا پروگرام بنارہے ہیں۔"

(انگریزی سے ترجمہ)

اس نے جذباتی آواز میں صرف اتنا کہا کہ "میں ایک بار پھر سے عید مناؤں گا"

چھ ماہ کی جگہ پر آٹھ برس ہندوستانی جیلوں میں کاٹ کر پاکستانی فدا حسین اپنے وطن روانہ

فدا حسین اٹاری ریلوے اسٹیشن پر سمجھوتہ ایکسپریس میں سوار ہوتے ہوئے یوں رو رہے تھے جیسے کوئی بچہ روتا ہے۔ یہ ۲۳ مئی کا واقعہ ہے۔ دراصل فدا حسین اپنے چار دوسرے ساتھیوں۔ محمد علی، احمد، اعظم علی اور گونگا۔ کے ہمراہ ۸ سال مختلف ہندوستانی جیلوں میں کاٹ کر اپنے وطن پاکستان واپس جارہے تھے۔ پریس والوں سے فدا حسین، جذبات سے بھری آواز میں بس اتنا کہہ سکے کہ "میں ایک بار پھر سے عید مناؤں گا۔"

آٹھ سال قبل فدا حسین اور دوسرے چار پاکستانی غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے کے جرم میں گرفتار کیے گئے تھے۔ یہ سب سرحد کے پار قریبی پاکستانی گاؤں کے باشندے ہیں۔ ہندوستانی کورٹ نے انہیں صرف ۶ ماہ کی سخت سزا دی تھی۔ اور کہنے کو اس کے بعد وہ سرکاری طور پر، برس قبل رہا کردیے گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ عدالتی تحویل میں سڑتے رہے۔

کبھی بھی کوئی سنجیدہ کوشش انہیں پاکستان بھیجنے کے لیے نہیں کی گئی۔ پولیس یہی کہتی رہی کہ انہیں پاکستان کیسے بھیجا جائے کیوں کہ ان کے پاس جائز سفری کاغذات نہیں ہیں۔ ان "عقلمندوں" کو کون سمجھاتا کہ اگر جائز سفری کاغذات کے ساتھ وہ آئے ہوتے تو غیر قانونی طور پر ہندوستان میں داخل ہونے کے جرم میں جیل کی سزا کیوں کاٹتے۔

> آٹھ سال قبل فدا حسین اور دوسرے چار پاکستانی غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے کے جرم میں گرفتار کیے گئے تھے۔ ہندوستانی کورٹ نے انہیں صرف ۶ ماہ کی سخت سزا دی تھی۔ اور کہنے کو اس کے بعد سرکاری طور پر، برس قبل رہا کردیے گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ عدالتی تحویل میں سڑتے رہے۔

بہرحال فدا حسین اور ان کے ساتھیوں کی دعا خدا نے اس وقت سن لی جب چنڈی گڑھ میں مقیم حقوق انسانی کے چمپین وکیل جناب رنجن لکھن پال کی ان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ان پاکستانیوں کی طرف سے پنجاب و ہریانہ ہائی کورٹ میں رٹ داخل کی جس کا فیصلہ ان کے حق میں سنایا گیا۔ اور اس طرح ان پاکستانیوں کو دوبارہ آزادی نصیب ہوئی۔

یہ مثالی فیصلہ پنجاب و ہریانہ کورٹ نے گذشتہ سال اکتوبر میں سنایا تھا۔ اس فیصلے میں جسٹس ایچ۔ ایس بیدی نے پنجاب حکومت اور مرکزی حکومت کو نہ صرف ان پاکستانیوں کو وطن بھیجنے کی ہدایت کی تھی بلکہ پنجاب انتظامیہ سے ان میں سے ہر ایک کو غیر قانونی طور پر جیل میں رکھنے کے تاوان کے طور پر ۲۵ ہزار روپے دینے کا بھی حکم دیا تھا۔ جسٹس بیدی نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ اگر سفارتی ذرائع سے ان پاکستانیوں کی واپسی ممکن نہیں ہو پاتی تو انہیں سمجھوتہ ایکسپریس پر بٹھادیا جائے۔ دراصل اس فیصلے کے لیے لکھن پال نے عدالت کو یقین دلایا تھا کہ ان پاکستانیوں کے رشتہ دار سرحد پار ان کے لیے سارے انتظامات کرنے کو تیار ہیں۔

کورٹ کے حکم پر عمل کرتے ہوئے ایک پانچ رکنی کمیٹی بنائی گئی جس میں سول افسران کے ساتھ بارڈر سیکورٹی فورس کے افسران بھی شامل تھے۔ اس کمیٹی کی نگرانی میں ان پانچوں پاکستانیوں کو امرتسر جیل سے نکال کر اٹاری ریلوے اسٹیشن لے جایا گیا جہاں سے چار گھنٹہ بعد سمجھوتہ ایکسپریس پر بٹھادیا گیا۔ پنجاب پولیس نے اس پوری کارروائی کی ویڈیوگرافی بھی کی تاکہ کورٹ کو یہ یقین دلاسکے کہ اس کے حکم پر عمل کیا جاچکا ہے۔ فدا حسین اور دوسرے پاکستانی بے انتہا خوش اور لکھن پال وکیل اور جسٹس بیدی کے بے انتہا ممنون تھے۔ ۲۵ سالہ محمد علی نے یہ کہہ کر سب کے جذبات کی ترجمانی کردی کہ "ہمارے لیے تو وکیل صاحب اور جج صاحب پیغامبر ہیں۔"

ڈوموں نے بی جے پی کی کامیابی پر جلوس فتح اور مسلمانوں نے جلوس محرم نکالا اور فساد ہو گیا

کلکتہ فساد کے اسباب کی چھان بین کرنے والی ایک رپورٹ

کلکتہ میں محرم کے جلوس کو لے کر فساد ہو گیا جس میں ۶ افراد ہلاک اور کئی زخمی ہو گئے۔ کئی لوگوں کی حالت نازک ہے۔ ہلاک شدگان کی تعداد میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے۔ کہنے کو تو یہ فرقہ وارانہ فساد ہے لیکن اس میں زیادہ تر ہلاکتیں پولیس فائرنگ میں ہوئی ہیں۔ ابتدائی رپورٹوں سے پتہ چلا تھا کہ غلطی جلوس والوں کی تھی۔ پہلے سے طے شدہ راستے کے بجائے ایک نئے راستے سے تعزیہ کا جلوس لے جانے پر ضد کی بنا پر فساد پھوٹ پڑا۔ اہل جلوس نے پولیس والوں پر حملہ کیا اور نتیجے میں پولیس نے فائرنگ کی۔ کرفیو لگایا اور بالآخر حالات کو کنٹرول کرنے کے لیے فوج کو بلانا پڑا۔ لیکن جوں جوں خبریں آنے لگیں حقائق منظر عام پر آنے لگے اور ان سے ایک بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ جہاں جلوس میں شامل افراد کا قصور تھا وہیں پولیس والے بھی کم قصوروار نہیں ہیں۔ حالات کئی دنوں سے کشیدہ تھے لیکن مذاکرات کے ذریعہ مسئلہ سلجھانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔

اطلاعات کے مطابق فساد کی جڑ ضد اور انا ہے لیکن کسی ایک فرقہ کی نہیں بلکہ دونوں فرقہ کی۔ اقبال پور پولیس تھانہ علاقہ میں میور بھنج روڈ کی آبادی کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا محلہ ڈوم پٹی کے نام سے ہے جہاں ڈوم رہتے ہیں۔ مسلمانوں اور ڈوموں کے ذریعے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے نتیجے میں یہ فساد ہوا۔ دراصل مرکز میں بی جے پی کی حکومت بننے کے بعد ڈوموں نے ایک فتح کا جلوس نکالا تھا جو مسلم علاقوں سے گزارا گیا تھا۔ اس پر مسلمانوں میں غصہ تھا اور انہوں نے محرم کے موقع پر ضد کی کہ وہ ڈوموں کے محلے سے جلوس نکالیں گے۔ پولیس کو پہلے سے اس کشیدگی کا علم تھا لیکن اعلی افسران اس کا صحیح اندازہ لگانے میں ناکام رہے۔

پولیس نے اس سلسلے میں دو بیانات دیے ہیں۔ اور دونوں میں کچھ باتیں مشترک ہیں اور کچھ متضاد۔

> اگر پولیس نے نئے راستے کی اجازت نہیں دی تھی تو اس راستے کو اختیار کرنے کی ضد کو دانشمندی نہیں کہا جاسکتا۔ یہ تو جان بوجھ کر خود کو ہلاکت میں جھونکنا ہوا

جو باتیں مشترک ہیں وہ یہ ہیں کہ اس علاقہ میں تعزیہ کے جلوس کے لیے پولیس نے اجازت دی تھی۔ میور بھنج روڈ اور بھوکیلاش روڈ سے ایک غیر قانونی جلوس ڈوم پٹی ہوتا ہوا اقبال پور چوک کے اصل جلوس میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ لیکن یہ راستہ پہلے کے روایتی راستوں سے الگ تھا۔ دوسری طرف پولیس کا یہ بھی کہنا ہے کہ مسلمان ڈوم پٹی سے جلوس لے جانا چاہتے تھے تاکہ وہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کر سکیں۔ اور اس کا تعلق ڈوموں کے جلوس فتح سے تھا۔ بعد میں پولیس نے بیان دیا کہ گذشتہ سال تک جلوس قانونی طور پر بھوکیلاش روڈ پر نکلتا تھا۔ لیکن اس سال انہوں نے اقبال پور کے جلوس میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔

☆ کرفیو اور پولیس کی فائرنگ

جلوس میں شامل لوگوں کی دلیل تھی کہ حسین شاہ روڈ سے جانے والا راستہ جہاں سے ہمیشہ جلوس گذرتا تھا کافی طویل ہے اسی لیے اقبال پور پولیس تھانہ سے نئے راستے کی اجازت لی گئی۔

جب کہ پولیس کا کہنا ہے کہ اس نے ڈوم پٹی سے گذرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ پولیس کے بقول جلوس والوں نے اقبال پور تھانہ میں درخواست دی تھی کہ انہیں نئے راستے کی اجازت دی جائے اور ان کی درخواست کی وصولیابی کی رسید انہیں دی گئی جسے انہوں نے راستے کی پرمٹ سمجھ لیا۔

تقریبا دو ماہ قبل مسلمانوں اور ڈوموں میں بھوکیلاش روڈ کی ایک گلی میں واقع پانی کے نلکے سے پانی لینے کے معاملے پر تنازعہ ہو گیا تھا دونوں فرقے اس پر اپنا حق جتا رہے تھے۔ اس موقع پر دونوں میں جھڑپ بھی ہوئی تھی جس میں ایک ۲۵ سالہ نوجوان کو چاقو لگا تھا مگر پولیس نے کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ گذشتہ دو ماہ سے کشیدگی تھی لیکن پولیس انتظامیہ نے محرم کے جلوس کے پیش نظر کوئی احتیاطی قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں محسوس کی یہاں تک کہ دونوں فرقوں کی کوئی میٹنگ بھی نہیں بلائی گئی۔

☆ فساد کی کہانی کہتا اقبال پور

مقامی غنڈے اور غیر سماجی عناصر کشیدگی کو پروان چڑھانے میں ملوث رہے اور پولیس تماشہ دیکھتی رہی۔

موصولہ اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ پولیس کی ناقص کارکردگی فساد بھڑکانے میں معاون رہی لیکن جلوس میں شامل مسلمانوں کو بھی بے قصور نہیں کہا جاسکتا۔ ڈوموں کے محلے سے جلوس گزار کر طاقت کا مظاہرہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر پولیس نے نئے راستے کی اجازت نہیں دی تھی تو اس راستے کو اختیار کرنے کے ضد کو دانشمندی نہیں کہا جاسکتا۔ یہ تو جان بوجھ کر خود کو ہلاکت میں جھونکنا ہوا، اور پھر ایسی جگہ جہاں دو مہینے سے چل رہی کشیدگی پر پولیس خاموش تماشائی بنی رہی وہاں اس سے کیا توقع تھی کہ وہ انصاف سے کام لے گی۔ اطلاعات کے مطابق پولیس نے جان بوجھ کر مسلم مظاہرین کو نشانہ بنایا اور انہیں گولی ماری۔ جلوس میں شامل مسلمانوں کے اس اقدام کو کسی بھی قیمت پر دانشمندانہ نہیں کہا جاسکتا۔

جب کلکتہ کے علی پور کی پولیس غنڈہ گردی پر اتر آئی

کلکتہ یعنی جمعرات کا دن۔ کلکتہ کے فساد زدہ علاقہ میں پولیس کی غنڈہ گردی کا دن تھا۔ علی پور باڈی گارڈ لائنز علاقہ میں تقریبا ڈیڑھ سو پولیس والے اودھم مچائے ہوئے تھے اور اقبال پور کی طرف سے گزرنے والے راہ گیروں کو بری طرح پیٹ رہے تھے۔ ان میں اور غنڈوں میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں لاٹھی، اینٹ اور سوڈا واٹر کی بوتلیں تھیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے دوسری بٹالین کے اپنے ساتھیوں پر بھی حملہ کیا اور سڑک کے کنارے بنی عبادت گاہ کو نشانہ بنایا۔ وہ فرقہ پرستانہ نعرے بھی لگا رہے تھے۔

اس کے جواب میں دوسری طرف سے باڈی گارڈ لائنز کی بیرکوں پر دوسرے وردی پوشوں نے حملہ کیا۔ پولیس والوں کے ساتھ مقامی غنڈے بھی تھے جن سے پولیس کے دوستانہ مراسم ہیں۔ ان سب نے راہ گیروں کو جن میں بچے بھی شامل تھے اور اسکوٹر اور کاروں پر سوار لوگوں کو بھی بری طرح زد و کوب کیا۔ وہ گاڑی والوں کو راستہ بدلنے پر مجبور کر رہے تھے جبکہ وہاں ٹریفک پولیس تعینات تھی لیکن ٹریفک کا جوان بے بسی سے پولیس کی اس حرکت کا مشاہدہ کرتا رہا۔ وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا جب علی پور باڈی گارڈ لائنز کے پولیس جوانوں نے قانون اپنے ہاتھ

میں لیا۔ جبکہ اعلی پولیس افسران کی ایسی کوئی ہدایت نہیں ہوتی ہے اس سے پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب نچلی سطح کے پولیس جوان غنڈہ گردی کرتے ہیں تو ان کے افسران یا ذمہ داران بیرکوں میں بیٹھے رہتے ہیں اور باہر آکر انہیں روکنے کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔ ۳۰ مئی کو جب شام تک پولیس کی غنڈہ گردی جاری رہی تو فوج نے آکر انہیں واپس ان کے بیرکوں میں بھیجا۔ دراصل باڈی گارڈ لائنز کی یہ بیرک وردی پوش غنڈوں اور غری سماجی عناصر کی پناہ گاہ بن گئی ہے۔ لیکن سینئر افسران ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی جرات نہیں کرتے۔ کیونکہ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق برسر اقتدار جماعت کے سیاستدانوں سے ہے اور وہ ان کے قریبی ہیں یا انہیں خوش کرتے رہتے ہیں۔ ان کا تعلق سی پی ایم کی پولیس تنظیم "کلکتہ پولیس ایسوسی ایشن" سے بھی ہے۔ حالیہ غنڈہ گردی میں ایسوسی ایشن کے معروف ممبران بھی شامل تھے۔

پولیس والے مقامی اور پڑوسی غنڈوں کو بیرکوں میں پناہ دیتے ہیں۔ وہیں ان میں سودے بازی ہوتی ہے۔ یہ غنڈے سٹے کا کاروبار کرتے ہیں۔ بہت سے عارضی قحبہ خانہ اور غیر قانونی شراب کا بھی دھندہ کرتے اور ان کا معاوضہ پولیس کو ادا کرتے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ پولیس والے باہری لوگوں کو بیرکوں میں ٹھہرنے کی اجازت دے کر ان سے پیسے وصول کرتے ہیں۔ گذشتہ پانچ برسوں سے ان بیرکوں میں یہ غیر قانونی سرگرمیاں چل رہی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ لوگ ڈسپلن شکنی اور پولیس ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی کر کے یہاں ایک متوازی پولیس انتظامیہ چلا رہے ہیں تو بیجا نہ ہو گا۔ کبھی کبھی ان کا آپس ہی میں جھگڑا ہو جاتا ہے۔ ایک سال پہلے ایک باورچی کو کچھ پولیس والوں نے ابلتے ہوئے پانی کی کڑھائی میں پھینک دیا تھا۔ جس میں وہ بری طرح جھلس گیا مگر قصور واروں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ پڑوس میں رہنے والوں کا الزام ہے کہ پولیس جوان ان کے گھروں کی خواتین کو چھیڑتے ہیں لیکن ان کے خوف کی بنا پر وہ احتجاج نہیں کر پاتے۔ ایک سینئر پولیس آفیسر کا کہنا ہے کہ ہم انکے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی سوچ بھی نہیں سکتے کیونکہ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق برسر اقتدار سیاستدانوں سے ہے۔

(بشکریہ ٹیلی گراف)

ضروری اطلاع

ملی ٹائمز کے دیرینہ کرم فرما، بہار کی معروف تنظیم مونس کے
سکریٹری جنرل اور پٹنہ میں ملی پارلیامنٹ کے حالیہ اجلاس کے ناظم اعلی
جناب سید محمد کمال الظفر صاحب

ان دنوں ملی ٹائمز کی تشہیر اور استحکام کے لئے جنوب کے دورے پر ہیں۔
ملی ٹائمز کے بہی خواہوں سے گذارش ہے کہ وہ آپ کو ہر ممکن تعاون سے نوازیں۔

(ادارہ)

مرسڈیز کاروں کے شانہ بہ شانہ گدھا گاڑیوں کا ہجوم ناہموار معیشت کا آئینہ دار

مصر میں غربت و افلاس کا ٹائم بم پھٹا چاہتا ہے

مصر کا دارالحکومت قاہرہ، دنیا کے ان چند بڑے شہروں میں سے ایک ہے جہاں ایک کروڑ سے زائد لوگ آباد ہیں، فطری طور پر یہاں بھی بھیڑ بھاڑ کے اوقات میں سڑکوں پر جام لگ جاتا ہے۔ اگر قاہرہ کی کسی مشغول شاہراہ پر ٹریفک جام ہوجائے تو وہاں آپ موجودہ مصر کی اصلی حالت کا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔

آپ اسی ایک روڈ پر پتھر کے زمانے سے لیکر جدید دور تک کی ہر سواری دیکھ سکتے ہیں۔ وہیں آپ کو گھوڑا یا گدھا گاڑی بھی ملے گی اور ائر کنڈیشنڈ مرسڈیز بھی۔ اسی کے ساتھ بسیں بھی ہوں گی جن میں لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح بھرے ہوں گے۔ یہ منظر صرف مصری انارکی کی طرف اشارہ نہیں کرتا بلکہ وہاں کی معاشی نابرابری کا بھی عکاس ہے۔ آخر ایک ایسے ملک میں جہاں کی سالانہ اوسط آمدنی صرف سات سو ڈالر ہے، وہاں اتنی زیادہ قیمتی درآمد شدہ کاریں کیسے پائی جاتی ہیں؟ مزید برآں جہاں اتنے سارے لوگوں کے پاس قیمتی کاریں ہیں وہیں اب بھی کچھ لوگ اتنے غریب کیوں ہیں کہ گدھا گاڑیوں میں سفر کرنے پر مجبور ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک سڑک پر مرسڈیز اور گدھا گاڑی کی موجودگی مصری معیشت کی عکاس ہے۔ درحقیقت گذشتہ دو دہائیوں میں مصر میں دولت اور غربت دونوں میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں خاص طور سے امیر، امیر ترین اور غریب، غریب تر ہوتا گیا۔ اس وقت غریبی لائن سے نیچے زندگی بسر کرنے والے ۳۰ فیصد تھے جو اب بڑھ کر ۵۰ فیصد ہوگئے ہیں۔ سو میں سے ۵۰ افراد کی غریبی لائن سے نیچے زندگی بسر کرنا ایک سماجی خطرہ ہے یا ٹائم بم جو کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔

مصری ماہرین معاشیات کہتے ہیں کہ امیر و غریب کے درمیان یہ زبردست فرق ۱۹۹۰ء کی دہائی کی پیداوار ہے۔ ۱۹۹۱ میں انٹرنیشنل مونیٹری فنڈ سے ایک معاہدے کے بعد کئی ایسی معاشی اصلاحات نافذ کی گئیں جن کا مقصد ملک کی کھلے مارکیٹ کی طرف پیش رفت میں مزید تیزی لانا تھا۔ ان اصلاحات کے نتیجے میں نجی شعبے کے منافع اور فوائد میں تو زبردست اضافہ ہوا لیکن حکومت کو اپنی ایسی کئی اسکیمیں ختم کرنی پڑیں جن سے عوامی سہولیات دستیاب ہوتی تھیں۔ عوامی ضروریات و سہولیات پر حکومت کے کم خرچ کرنے کی وجہ سے ملکی معیشت زبردست عدم مساوات کا شکار ہوگئی۔

اس نئی معاشی پالیسی سے، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، نجی شعبے کو بہت زیادہ فائدہ ہوا اور وہ امیر سے امیرتر اور امیرتر سے امیرترین ہوتے گئے۔ اسی نئی دولت کا اظہار کار کلچر کی شکل میں ہوا۔ آج مصر کے ہر امیر شخص کا خواب ایک مرسڈیز کار ہے اور ایک محدود طبقے میں دولت کی ریل پیل سے بہتوں کا یہ خواب شرمندہ تعبیر بھی ہورہا ہے۔ اس موقت مصر میں کم از کم تیس ہزار مرسڈیز کاریں موجود ہیں۔ قاہرہ سے باہر ایک مرسڈیز پلانٹ بھی تعمیر ہورہا ہے جو بہت جلد مرسڈیز کاریں بازار میں فروخت کرنا شروع کردے گا۔ بعض کار فروخت کرنے والے امید کرتے ہیں کہ رولس رائس بھی بہت جلد بڑی تعداد میں مصر میں بکنے لگے گی۔ جیگوار، کیڈی لک اور بی ایم ڈبلیو جیسی کاریں بھی مارکیٹ میں تیزی سے آرہی ہیں۔ غیر ملکی کاریں درآمد کرنے پر مصر میں بہت ڈیوٹی لگائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ایک کار کی قیمت میں ۲۵۰ فیصد اضافہ ہوجاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود لوگ دھڑا دھڑ باہر سے کاریں منگارہے ہیں۔ ۱۹۹۲ میں مصر میں کل بیس ہزار پسنجر کاریں فروخت ہوئی تھیں جو ۱۹۹۵ میں بڑھ کر ۵۰ ہزار سے زائد ہوگئیں۔ ان میں سے آدھی سے زیادہ کاریں غیر ملکی تھیں۔

> آپ اسی روڈ پر پتھر کے زمانے سے لیکر جدید دور تک کی ہر سواری دیکھ سکتے ہیں۔ وہیں آپ کو گھوڑا یا گدھا گاڑی بھی ملے گی اور ایر کنڈیشنڈ مرسڈیز بھی۔ اسی کے ساتھ بسیں بھی ہوں گی جن میں لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح سے بھرے ہوں گے۔ یہ منظر صرف مصری انارکی کی طرف اشارہ نہیں کرتا بلکہ وہاں کی معاشی نابرابری کا بھی عکاس ہے۔

لیکن ان قیمتی کاروں کے تذکرے سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ مصری معیشت کافی استوار یا رو بہ ترقی ہے۔ بھاری اکثریت کے پاس ظاہر ہے کار نہیں ہے۔ بلاشبہ بعض لوگ ٹیکسی کا خرچ برداشت کرلیتے ہیں۔ ایک بہت بڑی تعداد پیدل ہی چل کر گزارا کررہی ہے اور اس سے کچھ کم تعداد سرکاری بسوں میں بھیڑ بکری کی طرح کرتی ہے۔ یہ بسیں خستہ حال ہیں، ہر بس میں سیٹوں کی تعداد سے دوگنا یا اس سے بھی زیادہ افراد سفر کرتے ہیں۔ یہ بسیں بڑے خطرناک انداز میں چلتی ہیں اور اکثر ریڈ لائٹ کی پروا نہیں کرتیں۔ گویا اپنی دہلی کی ریڈ لائن بسوں کے کلچر کی اتباع کرتی ہیں۔

امیر اور غریب کے درمیان اتنا بڑا فرق ہمیشہ سماجی تناؤ اور کشمکش کو جنم دیتا ہے۔ مصر کے اسلام پسند حکومت کی معاشی پالیسی کی اسی لیے تنقید کرتے تھے۔ لیکن حسنی مبارک ان کی تنقیدوں کو غور سے سننے کے بجائے چراغ پا ہوگئے اور ان پر سختیاں کرنے لگے۔ بعض تو ان سختیوں کو برداشت کرلے گئے لیکن کچھ دوسروں نے ہتھیار اٹھالیا اور حکومت سے برسرپیکار ہوگئے۔ حکومت انہیں دہشت گرد قرار دے کر ان کے خلاف غیر انسانی اقدامات کرتی رہتی ہے۔

باقی صفحہ ۱۲ پر

کل گلیوں میں کھلونے بیچتے تھے آج کروڑوں ڈالر کے مالک ہیں

بحرین میں ہندوستانی تاجروں کی کامیابی کی حیرت انگیز اور دلچسپ داستان

تیل کی دولت سے مالا مال خلیجی ریاستیں ہندوستان کے لاکھوں عوام کے دلوں میں ایک ایسے جزیرے کی امیج رکھتی ہیں جہاں وہ سب کچھ ہے جس کی انسان اس روئے زمین پر خواہش کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر طبقے کے لوگ ان ریاستوں کا رخ کرتے ہیں یا وہاں جاکر قسمت آزمائی کرنا چاہتے ہیں۔ لاکھوں تو بلاشبہ ایسے مزدور ہیں جو ہندوستان میں مناسب روزگار نہ ملنے کی وجہ سے وہاں گئے ہیں یا وہاں جانا چاہتے ہیں۔ لیکن بعض ایسے بھی ہیں جنہیں وہاں بعض ہندوستانیوں کی کامیابیوں کی داستان کھینچ کرلے جاتی ہے۔ یعنی ایک اچھے مستقبل کی آرزو انہیں خلیج کا رخ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

خلیجی ریاستوں میں سروس اور بلڈنگ یا تعمیراتی سیکٹر میں ہندوستانی بھرے پڑے ہیں۔ بازاروں میں بے شمار ہندوستانی چھوٹی بڑی تجارتوں میں مصروف ہیں۔ ہزاروں عرب خاندانوں میں گھریلو ملازم کے طور پر بھی کام کررہے ہیں۔ ہندوستانیوں کے شانہ بشانہ پاکستانی، بنگلہ دیشی اور سری لنکائی باشندے بھی مختلف کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔

بعض ہندوستانیوں نے، جو خلیج میں کام کی غرض سے بے سروساماں گئے تھے، اب ترقی کرکے بڑے بڑے بزنس قائم کرلیے ہیں اور کروڑ پتی ہوگئے ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن کے باپ دادا پہلے وہاں گئے تھے۔ ان لوگوں کی کامیابیاں بہت سارے ہندوستانیوں کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتی رہتی ہیں۔

> دادا بھائی اس چھوٹی عمر میں ہفتہ واری بازاروں میں زور سے بول لگاکر کھلونے بیچا کرتے تھے۔ لیکن آج وہ ایک ایسے خاندان کے سربراہ ہیں جس کے پاس کروڑوں روپے ہیں۔ ان کے پاس کھلونوں کے کئی ڈپارٹمنٹل اسٹور ہیں۔ رہائشی مکانات کے کئی بلاک، ایک چارستارہ والا ہوٹل، ایک ٹریول ایجنسی اور ایک تعمیراتی فرم ہے۔

ہندوستانی نژاد دولتمندوں میں سے ایک تاجر کا نام محمد دادا بھائی ہے۔ انہوں نے اپنا کیریر ۱۴ برس کی عمر میں بحرین میں شروع کیا۔ دادا بھائی اس چھوٹی عمر میں ہفتہ واری بازاروں میں زور سے بولی لگاکر کھلونے بیچا کرتے تھے۔ لیکن آج وہ ایک ایسے خاندان کے سربراہ ہیں جس کے پاس کروڑوں روپے ہیں۔ ان کے پاس کھلونوں کے کئی ڈپارٹمنٹل اسٹور ہیں۔ رہائشی مکانات کے کئی بلاک، ایک چار ستاروں والا ہوٹل، ایک ٹریول ایجنسی اور ایک تعمیراتی فرم ہے۔ دادا بھائی کے والد ۶۰ سال قبل بحرین آئے تھے جو بازار میں سائیکل سے گھوم گھوم کر سموسے بیچا کرتے تھے۔ ۵۲ سالہ دادا بھائی کہتے ہیں کہ اس وقت یہاں کوئی نہیں جانتا تھا کہ سموسے کیا ہوتے ہیں۔ اگرچہ اب ہندوستانی ہوٹل ہر کونے نکڑ پر پائے جاتے ہیں۔ دادا بھائی یہ بھی کہتے ہیں کہ یہاں بحرین میں کامیاب ہونے کے لیے یہاں کے بازار کی ذہنیت کو جاننا ضروری ہے۔

بابو کیول رام اور بھرت جشن مال بھی بحرین کے امیر ترین ہندوستانیوں میں سے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں کے دادا اس صدی کے آغاز میں بحرین آئے تھے جب یہاں تیل کی دولت نہیں تھی اور بڑی غربت پائی جاتی تھی۔ ان کے دادا نے اس وقت ایک چھوٹی سی دوکان قائم کی تھی۔ مگر ان دونوں بھائیوں نے مارکیٹنگ کی جدید تکنیک استعمال کرکے اپنی تجارت کو کافی وسیع کرلیا ہے۔ اب یہ نہ صرف بحرین میں بلکہ دوسری خلیجی ریاستوں میں بھی کئی ڈپارٹمنٹل اسٹور کے مالک ہیں۔ صرف بحرین میں ہر سال کی آمدنی دس ملین ڈالر ہے۔ کیول رام کہتے ہیں کہ اب تجارت کرنا آسان نہیں رہا۔ کیونکہ مقابلہ اب پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ کیول رام، اپنے دوسرے ہم مذہبوں سے بہت مختلف ہیں۔ وہ وہاں کے ماحول میں گم ہوجانے کے بجائے اپنے مذہب پر قائم ہیں۔ وہ ایک ہندو تنظیم کے صدر ہیں اور انہوں نے بحرینی حکومت کی اجازت سے ایک مندر کی تعمیر کی ہے۔

لیکن کامیابی کی کہانیوں میں سب سے دلچسپ ونے دیوان کی کہانی ہے۔ دیوان معدنیات کے ماہر انجینیئر ہیں۔ وہ بحرین ۱۹۷۷ء میں آئے اور اس وقت ان کی جیب میں صرف پچاس ڈالر تھے۔ انہوں نے سن رکھا تھا کہ سعودی عرب اور بحرین کے درمیان حائل سمندر پر پل

> بحرین اور سعودی عرب کے درمیان جو پل بنا ہے اس کی لمبائی ۲۵ کلومیٹر ہے اور اس کی تعمیر پر کل ۵۶۰ ملین ڈالر کا صرفہ آیا تھا۔ یہ پورا پل جس پتھر سے بنا ہے وہ سب کا سب ونے دیوان نے فراہم کیا ہے۔ اس سے آپ اس کی دولت کا اندازہ لگاسکتے ہیں۔

بننے والا ہے جس کے لیے پتھروں کی درآمد ضروری تھی۔ دیوان کہتے ہیں کہ "مجھے معلوم تھا کہ پتھر کی اینٹیں فراہم کرنے کے لیے بحرین مثالی مقام تھا لیکن کسی نے اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔"

بحرین اور سعودی عرب کے درمیان جو پل بنا ہے اس کی لمبائی ۲۵ کلومیٹر ہے اور اس کی تعمیر پر کل ۵۶۰ ملین ڈالر کا صرفہ آیا تھا۔ یہ پورا پل جس پتھر سے بنا ہے وہ سب کا سب ونے دیوان نے فراہم کیا ہے۔ اس سے آپ اس کی دولت کا اندازہ لگاسکتے ہیں۔

آزاد کردستان کے لئے کردوں کی سو سالہ جنگ کیا گل کھلایے گی

کیا اس جنگ کے شعلے ترکی اور شام کو ایک دوسرے سے بر سر پیکار کر دیں گے؟

اس صدی کے آغاز ہی سے کرد عوام کسی نہ کسی سے بر سر پیکار رہے ہیں۔ کرد سنی مسلمان ہیں اور ان کی اکثریت ترکی، ایران اور عراق میں آباد ہے۔ تھوڑے بہت شام میں بھی پائے جاتے ہیں۔ کبھی ان کردوں نے عراق میں تو کبھی ایران اور کبھی ترکی میں خود مختاری کا مطالبہ کیا۔ لیکن ہر حکومت نے ان کے مطالبے کو رد کر دیا۔ کرد ایک مدت سے ترکی اور عراق میں مسلح جدوجہد کر رہے ہیں۔ لیکن آج کل باقاعدہ لڑائی صرف ترکی کے محاذ پر ہو رہی ہے۔

ترکی کے خلاف مسلح بغاوت کردورکر پارٹی نے کر رکھی ہے جسے ترکی حکومت دہشت گرد کہتی ہے۔ ان لوگوں نے ۱۹۸۴ء سے ہتھیار اٹھا رکھا ہے۔ دسمبر ۱۹۹۵ء میں ورکر پارٹی نے یک طرفہ جنگ بندی کا اعلان کیا تھا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اپنے دفاع میں وہ فائر کر سکتے ہیں۔ لیکن ترکی حکومت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اس نے مطالبہ کیا کہ عبداللہ اوکلان کو ان کے حوالے کیا جائے۔ عبداللہ کردورکر پارٹی کے لیڈر ہیں اور ان کا ہیڈ کوارٹر شام میں ہے۔ ترکی نے شام کو بھی برے نتائج کی دھمکی دی۔ لیکن شام پر اس کا اثر نہیں ہوا۔ ادھر عبداللہ نے جنگ بندی کے ساتھ ہی ترکی حکومت سے مذاکرات کی پیش کش کی تھی جسے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا گیا کہ وہ اور ان کی پارٹی دہشت گرد ہیں۔ جنہیں ہر قیمت پر ختم کر دینا چاہیے۔

کردوں کے خلاف ترکی حکومت کی جنگ کافی مہنگی ثابت ہو رہی ہے۔ ترکی فوج Nato کی دوسری بڑی فوج ہے۔ اس کے تقریباً ۵ لاکھ فوجی جنوب مشرقی ترکی میں کردوں کے خلاف کارروائیوں میں مصروف ہیں۔ ظاہر ہے ان میں سے باقاعدہ جنگ میں بہت کم حصہ لے رہے ہیں اور زیادہ تر افراد شہریوں اور سڑکوں وغیرہ کی دیکھ بھال میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ترکی اس جنگ پر سالانہ ۷ ارب ڈالر خرچ کر رہا ہے۔

کردورکر پارٹی کے پاس بمشکل دس سے پندرہ ہزار کے قریب جنگجو ہیں جو زیادہ تر پہاڑوں میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں نے گاؤں کی حفاظت پر مامور ترک گارڈوں کو قتل کیا ہے، ٹیچروں کو بھی تہ تیغ کیا اور اسکولوں اور سرکاری آفسوں کو جلایا ہے اور ان گاؤں سے انتقام لیا ہے جو انہیں غذائی اشیاء فراہم نہیں کرتے۔ اسی طرح کردوں کے خلاف کارروائی کے ایک حصے کے طور پر ترک فوج نے ان گاؤں پر اپنا عتاب نازل کیا ہے جن پر کرد باغیوں کو غذا وغیرہ فراہم کرنے کا الزام ہے یا شبہ ہے۔ ان میں سے اکثر کو فوج نے گرفتار یا اغوا کیا اور کتنوں کو تہ تیغ کر دیا ہے۔

☆ کردورکر پارٹی کے مسلح باغیوں کی لاشیں ——— ترک فوجی ان کا شمار کرتے ہوئے

اس طرح کرد باغی اور فوج دونوں ہی بے گناہ لوگوں پر ظلم ڈھانے کا جرم کر رہے ہیں۔

> مغربی ممالک ایک آزاد کردستان کے حق میں نظر نہیں آتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ترکی کی سرزنش کرنے کے بجائے اس کی مدد کر رہے ہیں۔ امریکہ نے حال ہی میں بلیک ہاک اور کوبرا ہیلی کوپٹر دیے ہیں جو باغیوں کے خلاف استعمال کیے جا رہے ہیں۔ امریکہ کردوں کے خلاف جاسوسی سرگرمیوں میں بھی ملوث ہے اور ایسی خبریں وہ ترک حکومت کو دے دیتا ہے۔

ترکی حکومت نے اس جنگ میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد بتاتے ہوئے کہا ہے کہ ۱۹۸۷ اور مارچ ۱۹۹۶ کے درمیانی وقفہ میں ترک فوج نے ۱۵۶۶۳ دہشت گردوں کو ہلاک اور ۲۱۰ کو زخمی کیا ہے۔ جب کہ اسی وقفے کے دوران ۳ ہزار ۴ سو فوجی اور ۳۹۳۸ شہری بھی ہلاک ہوئے ہیں۔ لیکن ان اعداد و شمار پر غیر جانبدار لوگوں کو شاید ہی یقین آئے کیوں کہ گوریلا جنگ میں بالعموم شہریوں کی ہلاکت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

دو سال قبل ترکی کا جنوب مشرقی علاقہ عام شہریوں کے سفر کے لیے کافی مخدوش تھا۔ اب صورتحال بدل گئی ہے۔ کم از کم شہروں اور سڑکوں پر ترک فوج کا کنٹرول ہے اور کوئی بھی شخص کار سے عراقی سرحد تک جا سکتا ہے۔ ایسا اس لیے ممکن ہو سکا ہے کہ ترک فوج کی سخت کارروائی سے باغی پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے ہیں اور ان کے حملے اب اکا دکا ہی ہوتے ہیں۔ لیکن اس کارروائی کی وجہ سے جنوب مشرق کے کرد ترکی سے کافی بیزار ہو گئے ہیں اور بلاشبہ ان کی اکثریت باغیوں سے ہمدردی رکھتی ہے۔ یہ ترکی کے لیے کافی بڑا نقصان ہے جو کردوں کو کرد ماننے کے بجائے پہاڑی ترک کے نام سے پکارتا ہے۔

معاملہ صرف یہ نہیں ہے کہ کرد ترکی حکومت کے خلاف آمادہ بغاوت ہیں۔ دراصل ان میں آپس میں بھی کافی اختلافات ہیں اور وہ اکثر آپس ہی میں لڑ پڑتے ہیں۔ پھر کئی ملکوں میں تقسیم ہونے کی وجہ سے ان کی جدوجہد کئی حکومتوں کے خلاف ہے جو اپنے ملک کے کردوں کو دباتیں اور دوسرے ملکوں کے باغیوں کی ہمت افزائی کرتی ہیں۔

۱۹۸۴ سے شام کردورکر پارٹی کا اصل پشت پناہ ہے۔ شام کی ترکی سے ناراضگی اس بات پر ہے کہ اس نے دجلہ و فرات پر شام کو اعتماد میں لیے بغیر ڈیم بنا لیے ہیں جس سے شام کو ان دریاؤں سے کافی مقدار میں پانی نہیں مل پاتا۔ اگرچہ شام اور ترکی کی سرحد پر اتنی چوکسی ہے کہ کوئی گوریلا ادھر سے ترکی میں شامل نہیں ہو سکتا لیکن وہ بہ آسانی عراق اور پہاڑوں کے راستے سے ترکی میں آ جاتے ہیں۔ دراصل کرد باغی آج کل عراقی

باقی صفحہ ۹ پر

یہودی امن کے نہیں جنگ کے دلدادہ ہیں

نیتن یاہو کی کامیابی نے ثابت کر دیا کہ

اسرائیل انتخابات میں غیر متوقع طور پر دائیں بازو کی لیکوڈ پارٹی کے انتہاپسند لیڈر بنجامن نیتن یاہو کو کامیابی ملی ہے۔ نوبل امن انعام یافتہ شمعون پیریز کی، جن کی کامیابی کے بارے میں اسرائیل اور باہر کے مبصرین کو تقریباً یقین سا تھا، معمولی ووٹوں سے شکست ہو گئی ہے۔ واضح رہے کہ اس بار اسرائیل میں نئے انتخابی قوانین کے تحت وزیر اعظم کے عہدے کے لیے براہ راست ووٹنگ ہوئی تھی۔ پارلیمنٹ کے انتخابات ساتھ ہی ہوئے مگر ان کے لیے ووٹنگ کی خاطر دوسرا بیلٹ پیپر تھا

غیر متوقع انتخابی نتیجے سے مغربی ایشیا میں امن کے عمل کو ایک زبردست دھچکا لگا ہے۔ ایسے کسی بھی نتیجے سے امن کے عمل کو پہنچنے والے نقصان کا لوگوں کو پہلے ہی سے اندازہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شمعون پیریز کے خارجی حامیوں نے ان کی بھرپور مدد کی۔ امریکی صدر بل کلنٹن نے اگرچہ یہ کہا تھا کہ وہ اسرائیل کے انتخاب میں کسی پارٹی کے ساتھ نہیں ہیں، لیکن پیریز کے لیے ان کی پسندیدگی یا ان کی طرف ان کا جھکاؤ بالکل واضح تھا۔ جب حماس کے شہیدی دستوں نے چند حملوں سے پیریز کے انتخابی مستقبل پر سوالیہ نشان لگا دیا تھا تو امریکی صدر ہی کی کوششوں سے دنیا کے درجنوں لیڈروں نے مصر کے شرم الشیخ میں نام نہاد امن کانفرنس کر کے پیریز کی حمایت کی تھی۔ اس کے بعد امریکی صدر نے یروشلم جا کر پیریز کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر اسرائیلیوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ امریکہ ہر حال میں انکے ساتھ رہے گا۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی۔ جب پیریز نے دائیں بازو کی اس تنقید کے جواب میں کہ وہ کمزور وزیر اعظم ہیں، یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ عربوں کے مقابلے میں کسی بھی یہودی کی طرح سخت ہیں اور اس نکتہ کو ذہن نشین کرانے کے لیے انہوں نے لبنان پر چڑھائی کر دی تو بین الاقوامی سطح پر امریکہ ہی نے ان کی مدد کی۔ لیکن ایک موقع پر تو صدر کلنٹن نے ایک طرح سے براہ راست پیریز کی حمایت اس وقت کی جب انہوں نے کہا کہ اسرائیل کے ووٹر امید ہے امن کو جنگ پر ترجیح دیں گے۔

کلنٹن ہی کی طرح عرفات نے بھی پیریز کی حتی المقدور حمایت کی۔ انہوں نے پی ایل او کے چارٹر سے اسرائیل کو تباہ کرنے کی دفعہ کو ختم کر دیا اور حماس کے سیکڑوں کارکنوں اور لیڈروں کے بغیر چارج کیے اور مقدمہ چلائے جیلوں میں بھر دیا۔ حسنی مبارک اور اردن کے شاہ حسین نے بھی پیریز کی حمایت میں بیانات جاری کیے۔ لیکن اسرائیلی ووٹروں نے ان ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا اور شمعون کے بجائے انتہاپسند نیتن یاہو کو وزیر اعظم منتخب کر لیا۔

☆ بنجامن نیتن یاہو اپنی کامیابی پر عوام کو مبارک باد دیتے ہوئے

اسرائیلی عوام کے اس فیصلے پر ایک شامی اخبار نے تبصرہ کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ ان کی پسند سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ قوم امن کے بجائے جنگ کی دلدادہ ہے۔ اگرچہ شامی اخباروں نے امریکہ سے براہ راست مداخلت کی اپیل کی مگر اس سے ان کی مایوسی زیادہ جھلکتی ہے بہ نسبت امن کی امید کے۔

نیتن یاہو کی فتح سے بلاشبہ مغربی ایشیا میں امن کے عمل کو نقصان پہنچے گا۔ اپنی انتخابی تقریروں میں انہوں نے چند ایسی باتوں کے وعدے کیے ہیں جن پر عمل کرنے سے امن کے سبوتاژ ہونے کی پوری امید ہے۔ مثلاً انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مقبوضہ عرب علاقوں میں مزید یہودی بستیوں کے قیام کی اجازت دے دیں گے۔ اسی طرح ان کا وعدہ ہے کہ وہ عرفات اور فلسطینیوں کے ساتھ مزید سخت رویہ اختیار کریں گے۔ مزید برآں وہ یروشلم کے متعلق عرفات یا کسی عرب سے گفتگو کے قائل ہی نہیں ہیں جب کہ اوسلو معاہدے کے تحت اس مقدس شہر کے مستقبل پر گفتگو کا وقت آ رہا ہے۔

اس بات کا بھی امکان ہے کہ نئے وزیر اعظم مغربی کنارے اور غزہ پٹی کی مستقل حیثیت کے بارے میں ہونے والے مذاکرات کو یا تو ملتوی کر دیں یا انہیں یوں جاری رکھیں کہ اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ ایسے اعلانات اور وعدوں کی روشنی میں کوئی بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ مغربی ایشیا میں امن کا عمل خطرے سے دوچار ہے۔

اپنی فتح کے بعد اگرچہ بنجامن نیتن یاہو نے مصری صدر اور شاہ اردن سے ٹیلی فون پر گفتگو کی اور امن کے عمل کو جاری رکھنے کا عہد کیا ہے لیکن انہوں نے فلسطینی اتھارٹی کے صدر سے کوئی گفتگو نہیں کی ہے جو غیر فطری معلوم ہوتی ہے کیوں کہ بالآخر انہیں عرفات ہی سے مذاکرات کرنے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نئی لیکوڈ حکومت عرفات اور ان کی انتظامیہ کے تئیں سخت رویہ اختیار کرے گی۔ ایک انتہاپسند لیکوڈ لیڈر، جو پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے ہیں اور کابینہ میں بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ

باقی: صفحہ ۹ پر

ہندوستانی معاشرہ پر فحش اور اخلاق سوز رسائل کی یلغار

مغرب کی نقالی میں بے لباسی کو تن پوشی کی معراج قرار دیدیا گیا ہے

فیشن کا تصور ہم نے مغرب سے مستعار لیا ہے۔ جیسے ہی یہ لفظ ہم کسی کو بولتے ہوئے سنتے ہیں تو ذہن کے پردے پر نت نئی تراش خراش کے رنگ برنگے ملبوسات لہرانے لگتے ہیں۔ مغرب میں فیشن باقاعدہ ایک صنعت بن گیا ہے اور جامہ زیبی کی حدود سے نکل کر "جسم زیبی" کی سرحد میں داخل ہوچکا ہے۔ مشرق اور خصوصا ہندوستان جو زندگی کے بہت سے معاملات میں مغرب سے بہت پیچھے ہے ہوسکتا ہے کہ فیشن کے شعبے میں بھی پسماندہ رہتا لیکن برقی ذرائع ابلاغ کو دونوں کے درمیان طویل عرصہ کی دوری گوارہ کب ہوتی لہذا فیشن کا سیلاب اپنے تمام تر مغربی مظاہر کے ساتھ ہندوستانی معاشرے کا دامن بھگونے لگا ہے۔ فیشن کے نام پر شائع ہونے والے یہ رسائل اتنے فحش اور اخلاق سوز ہوتے ہیں کہ کوئی مہذب فیملی ان کو اپنے گھروں کی ٹیبل کی زینت بنانا پسند نہیں کرے گی، لیکن اعلی سوسائٹی کہے جانے والے معاشرے میں یہ رسائل اسٹیٹس اور معیار زندگی کی علامت بنتے جارہے ہیں اور ان گھروں میں ایسے رسائل کی بھرمار نظر آئے گی، فحش رسائل کی یہ بھرمار ہندوستانی معاشرے کو کہاں لے جائے گی اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ سوال اپنی جگہ پر باقی رہے گا کہ کیا ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کی بیشتر آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے جہاں کروڑوں افراد خط افلاس سے بھی نچلے معیار کی زندگی گذرانے پر مجبور ہیں، جہاں قحط، بھوک، جہالت اور بیماری جیسے سنگین بنیادی مسائل آج بھی ہم سے زندگی کی بقا کی ضمانت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کہاں تک فیشن کے اس نیم عریاں سیلاب کو برداشت کیا جاسکتا ہے۔

> فیشن میگزینوں کی قیمت مہنگے ترین عام میگزین کے مقابلے میں بھی کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اور شہروں کے تعلیم یافتہ اور مہذب طبقے سے تعلق رکھنے والے بیشتر افراد انہیں اس لیے بھی خریدتے ہیں کہ ان کی تنہائی کے ساتھی بھی بن جاتے ہیں

امریکہ اور یوروپ میں برقی میڈیا پر مختلف مصنوعات کے طرح طرح کے اشتہارات تو آتے ہی ہیں اس کے علاوہ فیشن میگزینوں کی بھی اپنی ایک دنیا ہے جس کا مرکزی تصور تو مختلف ڈیزائن کے ملبوسات کی نمائش ہوتا ہے لیکن دیدہ و دل کے لیے سامان نشاط کی فراہمی بھی ان میگزینوں کے ذمہ داران کو منظور ہوتی ہے۔ اس ادائے خاص کا سبب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ ایک طرف تو وہ کسی نو تراشیدہ ملبوس کی فروخت سے منہ مانگے پیسے کمانا چاہتے ہیں تو دوسری جانب حسن خود بین و خود آرا کے ہمراہ اس ملبوس کی بھڑکیلے رنگوں میں نمائش سے بھی خاص رقم کمائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ فیشن میگزینوں کی قیمت مہنگے ترین عام میگزین کے مقابلے میں بھی کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اور شہروں کے تعلیم یافتہ اور مہذب طبقے سے تعلق رکھنے والے بیشتر افراد انہیں اس لیے بھی خریدتے ہیں کہ ان کی تنہائی کے ساتھی بھی بن جاتے ہیں۔

> ہمارے یہاں کے قارئین جن کے لباس اور بالوں کی وضع قطع کے جملہ اختیارات آج بھی درزی اور حجام کے ہاتھوں میں ہیں ان کے لیے اس نوعیت کے میگزین علم میں اضافے کے بجائے وقت گذاری اور دلبستگی کا ذریعہ ہیں۔ ان میگزینوں کے ناشر اس نفسیات سے واقف ہیں اور اسی لیے وہ جا بجا بے لباسی کو تن پوشی کا منہ چڑانے کی کھلی چھوٹ دیدیتے ہیں۔

ہائی فیشن ملبوسات کی "پرکشش" اور "پر ترغیب" تشہیر کے لیے مغرب میں جو میگزین معروف حیثیت رکھتے ہیں ان میں "کاسموپولیٹن" اور "وگ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں کیونکہ ہمارے ہندوستانی ڈیزائنروں اور مشتہرین نے انہی دو رسائل کو اپنے لیے مشعل راہ بنایا ہے۔ بلکہ بعض اشتہارات میں تو ساری چیزیں جوں کی توں لے لی جاتی ہیں صرف قیمت کا ٹیگ ہندوستانی ہوتا ہے۔ ہندوستانی فیشن میگزینوں کے نام کے لیے بھی بھاری بھرکم الفاظ کا انتخاب کیا جاتا ہے خواہ وہ کانوں کو نامانوس ہی لگیں مثلا Domph اور Elle "کرما" اور "سوسائٹی فیشن" جیسے نام ذرا کم ہی سننے میں آتے ہیں۔ ان میگزینوں میں استعمال ہونے والے کاغذ کی کوالٹی فوٹو گرافی، اس میں پیش ماریشس کے ساحل یا سوئزرلینڈ کی کسی وادی کی ہوش ربا فضا میں مائل پرواز حسن آپ کو بے اختیار متوجہ کرلے گا۔ باہوش قاری "لطف کچھ پہلو بچا کر ہی نکل جانے میں ہے" پر عمل کرتے ہوئے یا تو اگلا صفحہ پلٹ دے گا یا میگزین ایک طرف رکھ دے گا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں کے قارئین جن کے لباس اور بالوں کی وضع قطع کے جملہ اختیارات آج بھی درزی اور حجام کے ہاتھوں میں ہیں ان کے لیے اس نوعیت کے میگزین علم میں اضافے کے بجائے وقت گذاری اور دلبستگی کا ذریعہ ہیں۔ ان میگزینوں کے ناشر اس نفسیات سے واقف ہیں اور اسی لیے وہ جا بجا بے لباسی کو تن پوشی کا منہ چڑانے کی کھلی چھوٹ دیدیتے ہیں۔
ہیں

بچوں کے ذہن پر اباحیت پسندی کی یلغار

برطانیہ کا ایک کلینک بچوں کو مفت کنڈوم تقسیم کرتا ہے

اباحیت پسندی انسان کو کس مقام تک لے جاسکتی ہے، اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب حال ہی میں برطانیہ میں انکشاف ہوا کہ وہاں ایک کلینک ایسا بھی ہے جو بچوں کو بھی کنڈوم فراہم کرتا ہے۔ واضح رہے کہ ایک سروے کے مطابق برطانیہ میں اوسطا تیرہ سال کی عمر تک بچے جنسی سرگرمی کا مظاہرہ کرچکے ہوتے ہیں۔ بلاشبہ بے شمار ایسے ہیں جو جنسی عمل سے اس عمر میں پرہیز کرتے ہیں۔ کئی ایسے بھی مل جائیں گے جو شادی سے قبل جنسی عمل نہیں کرتے۔ لیکن اوسطا برطانیہ میں ۱۳ سال کے بچے یہ عمل کر چکے ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کم عمری میں جنسی عمل کی وجہ سے نوعمر بچیوں کے حاملہ ہونے کے واقعات میں بہت اضافہ ہوا ہے جس سے برطانیہ کے والدین پریشان ہیں۔ یہ مرض اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ یہ ایک قومی مسئلہ بن گیا ہے۔

برطانوی اخبارات میں حال ہی میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ وہاں کے نابالغ اور کم عمر بچوں میں برتھ کنٹرول یا ضبط ولادت کا مطالبہ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ کنڈوم کی باقاعدہ راشننگ کرنی پڑی تھی۔ ان اخباری رپورٹوں کے مطابق کلینکوں میں موجود عملہ ان بچوں سے صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ عملا یہ کرکے بتائیں کہ وہ کنڈوم کو استعمال کرنا جانتے ہیں یا نہیں۔ اکثر ان سے یہ بھی پوچھا جاتا ہے کہ ان کی عمر ۱۳ سال یا اس سے زیادہ ہے یا نہیں۔

> بے شمار ایسے ہیں جو جنسی عمل سے اس عمر میں پرہیز کرتے ہیں۔ کئی ایسے بھی مل جائیں گے جو شادی سے قبل جنسی عمل نہیں کرتے۔ لیکن اوسطاً برطانیہ میں ۱۳ سال کے بچے یہ عمل کر چکے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کم عمری میں جنسی عمل کی وجہ سے نوعمر بچیوں کے حاملہ ہونے کے واقعات میں بہت اضافہ ہوا ہے جس سے برطانیہ کے والدین پریشان ہیں۔ یہ مرض اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ یہ ایک قومی مسئلہ بن گیا ہے۔

لیکن ایمپلیانٹ فیملی پلاننگ کلینک جو برسٹل میں واقع ہے، وہاں کے ڈاکٹر بوڈارڈ کہتے ہیں کہ بچوں سے ان کی عمر کا ثبوت نہیں مانگا جاتا۔ انہوں نے مزید کہا کہ بچے جو عمر بتاتے ہیں وہ غلط ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر انہیں اس (کنڈوم) کی ضرورت ہے تو ہم انہیں ان کی فراہمی یقینی بنائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہم بچوں کے والدین کو بلا کر یہ نہیں بتاتے کہ ان کے بچے جنسی طور پر سرگرم ہیں۔ ڈاکٹر بوڈارڈ کا کلینک ہفتے میں ایک دن مفت کنڈوم تقسیم کرتا ہے اور اس دن کسی مانگنے والے سے اس کی عمر وغیرہ سے متعلق سوال نہیں پوچھا جاتا۔ یہ مفت تقسیم ۴ اور ساڑھے ۶ بجے کے درمیان ہوتی ہے۔ چنانچہ بچے اسکول سے اپنے گھروں کو لوٹتے ہوئے اس کلینک سے کنڈوم مفت لے جاتے ہیں۔ اوسطا ہفتے میں ۱۵ بچے مفت کنڈوم لے جاتے ہیں۔

> ڈاکٹر بوڈارڈ کا کلینک ہفتے میں ایک دن مفت کنڈوم تقسیم کرتا ہے اور اس دن کسی مانگنے والے سے اس کی عمر وغیرہ سے متعلق سوال نہیں پوچھا جاتا۔ یہ مفت تقسیم ۴ اور ساڑھے ۶ بجے کے درمیان ہوتی ہے۔ چنانچہ بچے اسکول سے اپنے گھروں کو لوٹتے ہوئے اس کلینک سے کنڈوم مفت لے جاتے ہیں۔ اوسطاً ہفتے میں ۱۵ بچے مفت کنڈوم لے جاتے ہیں۔

اخباروں میں اس خبر کی اشاعت کے بعد بعض ممبران پارلیمنٹ نے سخت تنقید کی۔ انہوں نے مفت تقسیم کو مجرمانہ اور پاگل پن سے تعبیر کیا۔ قدامت پسند ایم۔ پی ڈیوڈ ولشائر نے کہا کہ "یہ بھلائی کا کام کرنے والے پاگل ہوگئے ہیں۔"

ایک دوسرے ایم۔ پی ونٹرٹن نے کہا کہ یہ جرم کے ارتکاب میں مدد ہی نہیں کررہے بلکہ اس کی ترغیب بھی دے رہے ہیں۔ یہ نہ صرف غیر اخلاقی و غیر قانونی ہے بلکہ خطرناک بھی اور اس پر فورا روک لگادینا چاہئے۔ "ونٹرٹن نے مزید کہا کہ "لگتا ہے انگریزی لغت سے "نہیں" کا لفظ نکال دیا گیا ہے"۔

لیکن اپوزیشن لیبر پارٹی کے ایک ایم پی ڈان پرٹیمورلو نے ایمپلیانٹ فیملی پلاننگ کلینک کے عمل یعنی بچوں کو ایک دن مفت کنڈوم تقسیم کرنے کے کام کا دفاع کیا ہے۔ ان کے بقول کم عمری کے جنسی عمل اور اس سے حمل ٹھہر جانے جیسے مسائل سے نمٹنے کا یہ ایک عملی طریقہ ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اس قومی مسئلے سے مذکورہ کلینک کا عملہ بہتر انداز میں نمٹنے کی کوشش کررہا ہے۔

کون ہے اس گاڑی کا ڈرائیور —— دیوگوڑا، نرسمہا راؤ یا وی پی سنگھ

دیوگوڑا جلد ہی بوریا بستر لپیٹ کر چلتے بنیں گے یا اپنے سیاسی حریفوں کے کان کاٹیں گے

مرکز میں قائم متحدہ محاذ کی حکومت کے سلسلے میں جتنے منہ اتنی باتیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ حکومت چند روزہ ہے اور جلد ہی یا تو وسط مدتی انتخابات ہوں گے یا نرسمہا راؤ کی قیادت میں ایک بار پھر کانگریس کی حکومت قائم ہوجائے گی۔ کوئی کہتا ہے کہ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ وزیر اعظم دیوگوڑا جتنے بھولے بھالے نظر آتے ہیں اتنے ہیں نہیں اور یہ بھی نرسمہا راؤ کی مانند سیاست کے میدان میں اپنے حریفوں کے کان کاٹیں گے۔ جب کہ کچھ لوگ کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کا خیال ہے کہ حکومت چل بھی سکتی ہے اور گر بھی سکتی ہے۔ لیکن بہر حال اکثریت اول الذکر خیال کے حامل افراد کی ہے۔ اسی کے ساتھ ایک سوال یہ بھی سیاسی حلقوں میں گردش کررہا ہے کہ اس حکومت کی گاڑی کی اسٹیرنگ کس کے ہاتھ میں ہوگی؟ جنتادل کے یا سی پی آئی کے۔ علاقائی پارٹیوں کے یا پھر کانگریس کے، جو کہ اگر حمایت نہ کرتی تو حکومت نہ بنتی۔ سیاسی مبصرین ان سوالات میں غلطاں اور ان کے جواب کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

بظاہر مختلف الخیال اور متضاد نظریات کے مجموعہ اضداد کی حکومت پر غیر یقینی کے گھرے بادل چھائے ہوئے ہیں اور دیوگوڑا کی قائدانہ صلاحیت بھی ابھی پردہ راز میں ہے۔ یہ حکومت اتنی متضاد ہے کہ ،، اور ۸۹ کی حکومتیں بھی ایسی نہیں تھیں۔ اس حکومت کے قیام میں اگر لیفٹ فرنٹ اور نیشنل فرنٹ کی حریف اول کانگریس کا اہم رول ہے تو علاقائی جماعتوں کا بھی کلیدی رول ہے اور علاقائی جماعتیں حکومت میں شامل بھی ہیں البتہ کانگریس کی حکومت میں شمولیت پر ابھی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ حالانکہ ایک طبقہ اس کے لیے راؤ پر دباؤ ڈال رہا ہے۔ حکومت میں شامل درجن بھر سے زائد پارٹیوں کے نظریات الگ الگ ہیں اور ان کے انتخابی منشور ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ اس لیے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ حکومت ایک دن انہی متضاد نظریات کے بوجھ سے دب جائے گی۔ ان متضاد نظریات اور اپنے اپنے گروپ کی بالادستی قائم کرنے کا اشارہ وزارت سازی کے دوران بھی ملا۔ جب ہر پارٹی نے وزارت میں زیادہ حصہ مانگا اور کچھ لیڈران مخصوص وزارتوں کی حصولیابی پر اڑ گئے۔ یوں تو تقریباً سبھی نے ایسی کوشش کی لیکن جنتادل کے صدر لالو یادو اپنی دھاک جمانے میں کامیاب ہوگئے اور دیوگوڑا کو ان کی پسند کے لیڈروں کو وزارتیں تقسیم کرنی پڑیں۔ ادھر ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی بھی اقتدار میں شریک ہوگئی جبکہ اس کی بہن مارکسی کمیونسٹ پارٹی ابھی حکومت میں شامل نہ ہونے کے اپنے موقف پر قائم ہے۔ سی پی آئی کا حکومت میں شامل ہونا فال نیک بھی ثابت ہوسکتا ہے اور فال بد بھی۔ اگر اتفاق رائے سے پالیسیاں ترتیب دی گئیں تو تصادم کی نوبت کا امکان کم ہے۔ سردست یہ امکان کم نظر آتا ہے کیونکہ پالیسی پروگرام کی تیاری میں جس طرح تمام پارٹیاں ایک نقطے پر متفق ہوگئیں وہ خوش گوار تبدیلی کا اشارہ دیتا ہے۔ لیکن کیا یہ اتفاق رائے اور ہم آہنگی آئندہ بھی قائم رہے گی۔ کہا نہیں جاسکتا۔

دوسری پارٹیوں کی طرح کانگریس بھی اس حکومت کو بلیک میل کرنے کی تاک میں ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ کانگریس اقتدار میں شریک ہی اس لیے ہوئی ہے کہ چند مہینوں میں اسے گرا کر ایسے حالات پیدا کردے کہ صدر اسے حکومت سازی کی دعوت دینے پر مجبور ہوجائیں اور نرسمہا راؤ ایک بار پھر وزیر اعظم بن جائیں۔ اس لیے راؤ نے حکومت سازی کے وقت یہ چال چلی تھی کہ علاقائی پارٹیاں حکومت میں شامل ہونے کے بجائے باہر سے حمایت دیں، وہ چاہتے تھے کہ ڈی ایم کے اس میں شامل نہ ہو۔ انہیں بہت امید تھی کیونکہ اس پارٹی کے صدر کرونا ندھی جنتادل کے لیڈروں سے خوش نہیں تھے اور انہوں نے شروع میں کہا تھا کہ وہ حکومت میں شامل نہیں ہوں گے۔ راؤ کا خیال تھا کہ ڈی ایم کے کی عدم شمولیت کا اثر دیگر پارٹیوں پر بھی پڑے گا اور تلگودیشم، ٹی ایم سی وغیرہ بھی اس میں شامل نہیں ہوں گی، لیفٹ پارٹیوں نے پہلے ہی عدم شمولیت کا اعلان کردیا ہے۔ اس کا لازمی تیجہ یہ ہوگا کہ یہ حکومت گرجائے گی۔ لیکن لالو یادو اور وی پی سنگھ کو جب اس سازش کی بھنک ملی تو دونوں سرگرم ہوگئے اور لالو کی گذراش پر وی پی سنگھ نے کرونا ندھی سے ملاقات کرکے انہیں حکومت میں شامل ہونے کے لیے راضی کرلیا۔ پھر تو آسام گن پریشد کے علاوہ ساری پارٹیاں شامل ہوگئیں۔ اس طرح وی پی سنگھ وزارتی گاڑی کی ڈرائیور کی سیٹ سے راؤ کو ہٹا کر خود بیٹھ گئے اور راؤ کے ہاتھوں سے اسٹیئرنگ چھین لی۔ سردست وی پی سنگھ راؤ پر بھاری ثابت ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وزارت کی حلف برداری کے وقت سب سے زیادہ اگر کوئی خوش تھا تو وہ وی پی سنگھ تھے۔

ان کے چہرے سے عیاں تھا کہ انہوں نے کسی بہت بڑی سازش کو ناکام بنانے میں کامیابی حاصل کرلی ہے ویسے اس حکومت کے بارے میں آسانی سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ گرجائے گی کیونکہ اس میں تجربہ کار وزراء کی شمولیت ہے اور سی پی آئی جیسی پارٹی کے لیڈروں کا تجربہ بھی شامل ہے۔ اس لیے اگر یہ حکومت دھیرے دھیرے گذشتہ حکومت کی مانند مستحکم اور مضبوط ہوجائے اور پورے پانچ سال چل جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اس حکومت سے بھی انہیں کوئی خاص امید نہیں ہے۔ پہلے نرسمہا راؤ تھے اور اب دیوگوڑا آگئے ہیں۔ صرف چہرے بدل گئے ہیں۔ گویا اب نرسمہا راؤ کا نام دیوگوڑا ہوگیا ہے۔

> اگر یہ حکومت دھیرے دھیرے گذشتہ حکومت کی مانند مستحکم اور مضبوط ہوجائے اور پورے پانچ سال چل جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اس حکومت سے بھی انہیں کوئی خاص امید نہیں ہے۔ پہلے نرسمہا راؤ تھے اور اب دیوگوڑا آگئے ہیں۔ صرف چہرے بدل گئے ہیں۔ گویا اب نرسمہا راؤ کا نام دیوگوڑا ہوگیا ہے۔

> راؤ کا خیال تھا کہ ڈی ایم کے کی عدم شمولیت کا اثر دیگر پارٹیوں پر بھی پڑے گا اور تیلگودیشم، ٹی ایم سی وغیرہ بھی اس میں شامل نہیں ہوں گی، لیفٹ پارٹیوں نے پہلے ہی عدم شمولیت کا اعلان کردیا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت گرجائے گی۔

ٹھیکیدار سے وزیر اعظم تک —— دیوگوڑا کا سیاسی سفر

حالیہ پارلیمانی انتخابات کے نتائج سامنے آنے کے بعد کسی نے دیوگوڑا سے سوال کیا تھا کہ کیا آپ وزیر اعظم بننا پسند کریں گے؟ جواباً گوڑا نے کہا تھا۔ "محض ۱۵ ممبران پارلیمنٹ کو جتا لے جانے یا ۳۵ سال سے سیاست میں رہنے کی وجہ سے کوئی قومی لیڈر نہیں بن جاتا۔ اور میں کرناٹک کی سرحدیں پار نہیں کروں گا۔" لیکن اس اعلان کے ایک ہفتے کے اندر ہی دیوگوڑا متحدہ محاذ کے امیدوار برائے وزارت عظمیٰ چن لیے گئے۔ وہ شخص جس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا کرناٹک کا وزیر اعلیٰ بننا رہی ہو، وہ اچانک ملک کا وزیر اعظم بننے والا تھا لیکن قسمت نے یہاں بھی دشواریاں پیدا کرنا ضروری سمجھا۔ ۱۳ دن کے لیے وزیر اعظم کی کرسی اٹل بہاری باجپئی نے چھین لی۔ بہر کیف حق بہ حقدار رسید کے مصداق اب اس کرسی پر دیوگوڑا براجمان ہوگئے ہیں۔ وہ کتنے، دنوں، مہینوں یا برسوں تک اس کرسی پر جلوہ فگن رہیں گے، اس کے بارے میں لب کشائی نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

دیوگوڑا نے سول انجینئرنگ میں ڈپلوما لے رکھا ہے۔ سیاست میں آنے سے پہلے وہ اپنے ضلع حسان میں تعمیراتی ٹھیکے لیا کرتے تھے۔ بعد میں انہوں نے کانگریس پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی۔ ۱۹۶۲ء میں وہ اس وقت کانگریس سے نکل گئے جب انہوں نے پارٹی امیدوار کے خلاف اسمبلی انتخاب میں بغاوت کردی۔

دیوگوڑا کا سیاسی کیریئر نشیب و فراز سے پر ہے۔ وہ ایم ایل اے اور ایم پی تو رہے ہی ہیں۔ کانگریس کے دیوراج ارس کی وزارت کے دوران

وہ اپوزیشن لیڈر تھے۔ رام کرشن ہیگڑے کی کیبنٹ میں وہ وزیر ہوئے۔ دراصل ہیگڑے کے وزیر اعلیٰ ہونے کے وقت بھی دیوگوڑا وزیر اعلیٰ کے عہدے کے امیدوار تھے۔ اس کے بعد یہ پوزیشن بومئی جی کو مل گئی۔ ۱۹۸۹ء کے انتخابات میں گوڑا دو اسمبلی حلقوں سے انتخاب لڑے اور ہار گئے۔ دو سال بعد وہ چندر شیکھر کی ایس جے پی کے ٹکٹ پر پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوگئے۔ بعد میں وہ پھر دوبارہ جنتادل میں شامل ہوگئے۔

گذشتہ اسمبلی انتخاب میں جنتادل کی کامیابی کے بعد وہ کرناٹک کے وزیر اعلیٰ بنے۔ وزیر اعلیٰ بننے کے بعد گوڑا نے خود کو ہمیشہ "دھرتی کے سپوت" کے طور پر پیش کیا اور کسانوں میں اپنی امیج کو بہت اجاگر کیا ہے۔ لیکن وہ ایک چالاک سیاستداں ہیں۔ انہوں نے جنتادل کی سماجی بنیاد کو بڑی ہوشیاری سے بہت وسیع کردیا ہے۔ "دھرتی کے سپوت" کی حیثیت سے وہ کسانوں سے قریب رہتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ بنگلور کے تاجروں اور صنعت کاروں سے بھی ان کے گہرے تعلقات ہیں۔
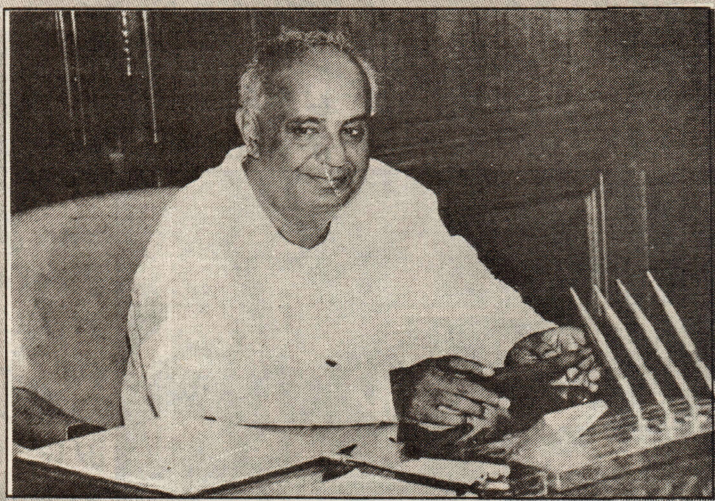
لوگ بالعموم دیوگوڑا کو رام کرشن ہیگڑے کے مقابلے میں دیہاتی کہتے ہیں۔ لیکن گوڑا کی وزارت کے دوران امریکی کامرس سکریٹری ران براؤن، سنگاپور کے وزیر اعظم اور دوسرے بڑے لیڈروں نے بنگلور کا دورہ کیا اور سبھی ان سے متاثر ہوئے ہیں۔ ران براؤن کی لبرلائزیشن کی وکالت کے جواب میں دیوگوڑا نے کہا تھا کہ ہمیں اس ضمن میں یکہ و تنہا کرنے کی کوشش بے سود ہوگی۔ جب کسی نے دیوگوڑا کو یاد دلایا کہ انہوں نے کرناٹک کی سرحد پار نہ کرنے کا اعلان کیا تھا تو انہوں نے کہا کہ وہ عہد پر قائم رہنا چاہتے تھے لیکن جب جیوتی بسو اور اندرجیت گپتا جیسے سینئر لیڈروں نے ان پر دباؤ ڈالا تو وہ اس پر راضی ہوگئے۔ دیوگوڑا کو جو لوگ قریب سے جانتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ بظاہر یہ دیہاتی شخص انتہائی قابلیت کا حامل ہے۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ متضاد عناصر کو ساتھ لے کر چلنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ہیگڑے اور بومئی جیسے لوگوں کی کمپنی میں سکون سے کرناٹک کے وزیر اعلیٰ بنے رہنا بذات خود ایک کامیابی ہے۔ اگر گوڑا اپنی اسی خوبی کو استعمال میں لائیں تو کوئی عجب نہیں کہ وہ عام لوگوں کی توقع سے زیادہ عرصے تک وزیر اعظم بنے رہیں۔

مسلمان ہندوتو کے ہاتھوں ملی ذلت کو کیسے فراموش کرسکتے ہیں

ہندوتو اور قومی دھارا ہندوازم کے نظریاتی ٹکسال میں ڈھلے ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں

تحریر: انرودھ دیش پانڈے

معاصر صحافت کے کالم میں ہم اہم موضوعات پر معروف اہل قلم اور صحافیوں کے مضامین شائع کرتے ہیں۔ یہ مضامین ہم مختلف قومی اخبارات سے منتخب کرتے ہیں۔ ان کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ قارئین دوسرے اخبارات کے قلم کاروں کے نظریات وخیالات سے واقف ہوسکیں۔ (ادارہ)

طبقے میں یہ رجحان پھر سے پنپ رہا ہے کہ مسلمان بی جے پی پر نظر ثانی کریں اور ہندوتو کو مسلم مخالف تصور نہ کرنے والے افراد کی طرف سے قومی دھارے میں شمولیت کا غیر منصفانہ فرمان مسلمانوں کے لیے پھر جاری کیا جارہا ہے۔ گویا کہ بی جے پی ہی قومی دھارے کی بھی نمائندہ ہے۔ لیکن یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ ایسے دعوؤں کی حقیقت کیا ہے۔

بابری مسجد کے انہدام پر مسلمانوں کے غم و غصے کا سبب اسلام کی "دقیانوسیت" نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد ایک فرقے کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگنا ہے۔ جب ہندوتو کی طاقتیں مسلمانوں کو ان کے پرکھوں کو پانچ صدی پہلے کے کارناموں پر معاف نہیں کرسکتیں تو جو اذیتیں ابھی چند برس پہلے انہیں صرف ہندوتو کے ہاتھوں جھیلنی پڑی ہیں مسلمان کیونکر بھول جائیں گے۔ بی جے پی بابری مسجد کے انہدام میں اپنے ملوث ہونے کی منکر ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ ایل کے ایڈوانی کی قیادت میں آگے بڑھنے والے اس کے لیڈروں نے ہی ایسا ماحول پیدا کیا تھا جس کے تحت کارسوک ایودھیا میں جمع ہوئے۔ اس کے علاوہ مسلمان بی جے پی سے وابستہ حقائق، اس کے نظریے اور طریقہ کار کو بھی کبھی نہیں بھولیں گے۔

سیکولر ہندو اور مسلمان دونوں بی جے پی سے یہ سوال کرسکتے ہیں کہ اپنے مقاصد کی نمائندگی کے لیے گیارہویں لوک سبھا انتخابات میں صرف دو مسلم امیدوار ہی کیوں ملے، اگر امیدواروں کا انتخاب کامیابی کے امکانات کے مطابق ہی ہونا تھا تو بی جے پی نے نتیجہ کیسے اخذ کیا کہ زیادہ تر مسلم امیدوار اس کے پلیٹ فارم سے ہار جائیں گے۔ اس کی وجہ محض یہ نہیں تھی کہ مسلمان بی جے پی کو فرقہ وارانہ جماعت سمجھتے ہیں۔

> اگر بی جے پی اقتدار میں آنے اور پرامن طور پر اقتدار کو برقرار رکھنے کی سیاست کو سمجھتی ہے تو اسے مسلمانوں اور اسلام کا گہرا مطالعہ کرنا ہوگا اور اس عمل میں اگر ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی تنظیمیں سیکولر بن جائیں تو بی جے پی، مسلمانوں اور ہندوستان سب کو اس کا فائدہ پہنچے گا۔ لیکن ایسا ہونا مشکل ہی نظر آرہا ہے

اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت بی جے پی بزعم خود ہندوتو کی علمبردار ہے اور اسلام کا اس سے براہ راست تصادم ہے اس لیے بی جے پی کو آسان زبان میں فرقہ پرست ہی کہا جاسکتا ہے۔

قومی دھارے کی وکالت ۱۹۸۰ کی دہائی میں درمیانی طبقے کے پڑھے لکھے افراد کا فیشن بن گئی تھی اور یہی زمانہ تھا جب بی جے پی کی قیادت میں بڑے پیمانے پر ہندو کی تنظیم بھی عمل میں آئی۔ لہٰذا قومی دھارا اور "فخر سے کہو ہم ہندو ہیں" کے نعرے اس ایک ہی سکے کے دو رخ تھے جو ہندوتو کے نظریاتی ٹکسال میں ڈھلا تھا۔

ہندوتو کے اعتدال پسند اور متشدد دونوں طبقوں کی طرف سے گذشتہ چند برس سے برابر مسلمانوں سے خیالی قومی دھارے میں شمولیت کا مطالبہ ہورہا ہے۔ خالصتان تحریک کی شدت کے زمانے میں روئے سخن سکھوں کی طرف بھی تھا لیکن پنجاب میں حالیہ انتخابی گٹھ جوڑ کی وجہ سے سکھوں کے لیے ہندوتو کے رویے میں نرمی آئی ہے۔ ابھی تک حالانکہ اس تصور کی وضاحت بھی نہیں ہوئی ہے لیکن ہندو فرقہ پرست قومی دھارے کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ بی جے پی کا یہ قومی دھارا معاشی سیاسی یا سماجی سیاق میں ہے یہ تو ہم نہیں جانتے لیکن اگر اس کی تعریف برہمنی اصطلاح میں کی جائے گی تو ہمیں اسے قبول کرنے میں تامل ہوگا کیونکہ اس میں غیر برہمن عناصر کی شمولیت کی گنجائش ہی نہیں ہوگی۔ اگر ہم قومی دھارے کی بجائے قومی زندگی کا فقرہ استعمال کریں تو اس میں مسلمانوں کی خدمات سے متعصب ترین شخص بھی انکار کی جرات نہیں کرسکے گا۔ اگر شکیل بدایونی کا کوئی بھجن یا حب الوطنی کا کوئی گیت قومی دھارے کی علامت نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔

اگر بی جے پی اقتدار میں آنے اور پرامن طور پر اقتدار کو برقرار رکھنے کی سیاست کو سمجھتی ہے تو اسے مسلمانوں اور اسلام کا گہرا مطالعہ کرنا ہوگا اور اس عمل میں اگر ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی تنظیمیں سیکولر بن جائیں تو بی جے پی، مسلمانوں اور ہندوستان سب کو اس کا فائدہ پہنچے گا۔ لیکن ایسا ہونا مشکل ہی نظر آرہا ہے، کیونکہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ پارٹی کے متشدد عناصر جمہوریت کاری کے عمل سے کیا سمجھتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ رام اور ہندوتو سے الگ ہوکر بی جے پی اپنی بااثر سیاسی تنظیم کی حیثیت باقی بھی رکھ سکے گی یا نہیں۔

(انگریزی سے ترجمہ)

۶ دسمبر ۹۲ کا حادثہ بی جے پی کے پیروں کی زنجیر بن گیا

یہ وہی تاریک دوپہر تھی جس نے بی جے پی کی کامیابی کے ساتھ اس کی ناکامی کے اسباب بھی متعین کردیے

پارلیمنٹ میں اعتماد حاصل کرنے کی حالیہ بحث نے واضح کردیا ہے کہ بی جے پی کی ہندوستانی سیاست میں اچھوت کی حیثیت ابھی باقی ہے اور اس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے پر معدودے چند افراد ہی تیار ہیں۔ جو چیز اس جماعت کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے ایودھیا کا مسئلہ۔ بابری مسجد۔ رام جنم بھومی تنازعہ کے سلسلے میں اٹل بہاری باجپئی کے تازہ ترین خیالات اس فرق کو اور بھی نمایاں کردیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مسئلہ ایودھیا کو سلجھانے کے دو طریقے ہیں باہمی گفت و شنید سے یا قانون سازی کرکے۔ لیکن اگر یہ دونوں طریقے دقت طلب ثابت ہوں تو جنونی ہجوم کے ہاتھوں مسجد کے ڈھانچے کا انہدام بھی ہوسکتا ہے۔ اور یہی بات انہوں نے وارانسی اور متھرا کی عبادت گاہوں کے بارے میں بھی کہی کہ اگر ان کے معاملے نے طول کھینچا تو وہ بھی بی جے پی کے ایجنڈے پر آجائیں گی اور اس طرح "ابھی تو پہلی جھانکی ہے، آگے متھرا کاشی ہے" کا نعرہ عملی صورت اختیار کرلے گا۔

یہ خیالات اس شخص کے ہیں جو اپنی پارٹی میں اعتدال پسند کہلاتا ہے تو پھر متشدد ممبران کا کیا حال ہوگا۔ اہم بات یہ نہیں ہے کہ انتہاپسندی اس جماعت کی پالیسیوں کی بنیاد ہے بلکہ یہ کہ آج تک کسی بھی پارٹی نے اتنی ڈھٹائی سے یہ کبھی نہیں کہا کہ اگر فلاں عبادت گاہ کا تنازعہ حل کرنے میں تاخیر ہوئی تو اس پر حملہ کردیا جائے گا۔ عموماً کوئی بھی پارٹی اپنے نمایاں اوصاف کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتی ہے اور اس میں اسے کوئی شرم بھی محسوس نہیں ہوتی۔ اگر بی جے پی کا خیال یہ ہے کہ جو باتیں اسے دوسروں سے نمایاں کرتی ہیں ان کے اظہار میں اسے محتاط رہنا ہے تو اسے یہ احساس ہونا چاہئے کہ ملک ایسے کسی نقطہ نظر کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہے۔ لیکن پارٹی ایسے نظریہ سے دست بردار بھی نہیں ہوسکتی۔ کیا اب بھی بی جے پی کو یقینی طور پر نہیں معلوم کہ اس کی گاڑی کس چیز کے سہارے چل رہی ہے۔ اور اگر اسے پتہ چل جائے کہ اتنی دور نکل آنے پر اسے ایودھیا کے مسئلہ کو پس پشت ڈال دینا چاہئے تو کیا وہ ایسا کرسکے گی؟

تاریخی اعتبار سے بی جے پی۔ جن سنگھ کی شدت پسندی کی بنیاد اقلیتوں اور خصوصاً مسلمانوں کے تئیں غیر ہمدردانہ رویے پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آرٹیکل ۳۷۰ کی مخالف ہے کیونکہ کشمیر مسلم اکثریت کا صوبہ ہے۔ آرٹیکل ۳۷۱ پر اسے کوئی اعتراض نہیں جس میں شمال مشرقی صوبوں کے لیے بعض عبوری اور خصوصی شقیں موجود ہیں۔ بی جے پی بنگلہ دیش کے دراندازوں کی مخالف ہے کیونکہ وہ مسلمان ہیں، وہ اردو کی مخالف ہے کیونکہ وہ مسلمانوں سے منسوب ہے۔ اس کے برعکس بنگلہ دیش کے ہندو اس کی نظر میں پناہ گزیں ہیں اور نیپال کے ساتھ لگی سرحد ہرگز قابل اعتراض نہیں۔ بی جے پی اپنے حامیوں سے اقلیتی کمیشن کو منسوخ کرنے کا بھی وعدہ کرتی رہی ہے کیونکہ مسلمانوں میں اس کی موجودگی سے مبہم سا تحفظ کا احساس پیدا ہوتا ہے چاہے یہ ادارہ اپنے آپ میں کتنا ہی غیر فعال کیوں نہ ہو۔ مسلمانوں کے خلاف زہر افشانیوں کے طویل سلسلے کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ مسلمان اس ملک کے وفادار بہت کم ہیں کیونکہ کرکٹ میچ میں پاکستانی کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں یا یہ کہ تیزی سے اپنی نسل میں اضافہ کرکے ملک کی آبادی کے توازن کو بگاڑتے ہیں۔

قابل غور بات یہ ہے کہ بی جے پی نے اس طرح کے سوالات کو ۱۹۸۹ کے الیکشن کے بعد کچھ زیادہ شدومد سے چھیڑنا شروع کیا ہے۔ وہ بھی اس امید پر کہ اگر اب نہیں تو اگلے انتخابات میں بہت کچھ حاصل کرلے گی۔ لیکن ایسا ہونا مشکل ہی ہے کیونکہ تنظیم کی وسعت کے بعد سے اندرونی اختلافات خاصے بڑھ گئے ہیں۔ اور اسی لیے اس کی جوڑتوڑ کا دائرہ اثر کافی محدود ہوگیا ہے۔ بی جے پی اس بات سے بھی بے خبر نہیں ہوگی کہ اعتماد کے ووٹ کے مسئلے پر اس کے اور دیگر اہم سیاسی گروہوں کے درمیان حیرت انگیز طور پر نمایاں ہوجانے والا اختلاف اور فاصلہ دراصل ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے واقعات کا ہی نتیجہ ہے۔ یہ وہی تاریک دوپہر تھی جس نے بی جے پی کی کامیابی کی حد کے ساتھ ساتھ اس کی ناکامی کے اسباب کا بھی تعین کردیا تھا۔

خود کو مظلوم ثابت کرنے کے لئے بی جے پی کی "مکمل جن آدیش یاترا"

باجپئی کی تقریر کے لاکھوں کیسٹ تقسیم کرکے عوامی جذبات کو مشتعل کرنے کا پلان

بی جے پی حکومت کو گرنے سے بچانے کے لیے سنگھ پریوار اور شیوسینا نے کیا کیا جتن نہیں کیے۔ ممبران پارلیمنٹ کو خریدنے کے لیے ارب پتی صنعت کاروں تک کی خدمات حاصل کی گئیں لیکن غیر بی جے پی پارٹیوں اور آزاد ممبران نے بی جے پی کو سیاسی اچھوت بنا کر رکھ دیا۔ دراصل انہیں خطرہ تھا کہ اگر انہوں نے حمایت کی اور پھر بھی بی جے پی کی حکومت گر گئی تو ان کے سیاسی کیریر پر ایک ایسا داغ لگ جائے گا جس کا آسیب زندگی بھر ان کا پیچھا کرتا رہے گا۔ بی جے پی کے ممبران آج کہتے ہیں کہ انہوں نے سوٹ کیس کلچر یعنی پیسوں سے خریدنے کی روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ خفیہ طریقے سے اس کی بھی کوشش کی گئی۔ بال ٹھاکرے نے رجنی کانت سے ملاقات کرکے انہیں رام کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے گھاس نہیں ڈالی۔ جب تمام کوششیں بے کار ثابت ہوگئیں تو یہ لوگ دھمکیوں پر اتر آئے۔

شیوسینا کے لیڈر بال ٹھاکرے نے کہا کہ اگر بی جے پی حکومت گرائی گئی تو ملک میں خانہ جنگی چھڑ جائے گی۔ اترپردیش کے مختلف شہروں میں حالات کشیدہ بھی ہوگئے تھے اور خفیہ محکمہ نے حساس شہروں کی رپورٹ بھی مرکز کو بھیج دی تھی۔ اس کے باوجود جب ایک بھی ممبران کی طرف نہیں آسکا تو بحث کا جواب دیتے ہوئے باجپئی نے دھمکی آمیز انداز میں کہا کہ وہ یہ لڑائی ایوان سے باہر سڑکوں پر لے جانے پر مجبور ہوجائیں گے۔ لیکن انہوں نے اپنی اس دھمکی کو خیالات کی لڑائی کا جامہ پہنادیا۔

اب جب کہ بی جے پی حکومت گر گئی ہے تو اس کو بنیاد بنا کر ملک بھر میں کشیدگی پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ بی جے پی نے ایک وسیع منصوبہ بنایا ہے جس کے تحت ایک اور یاترا نکالی جائے گی۔ اس کا نام ہوگا "پورن جن آدیش یاترا" یعنی مکمل اکثریت یاترا۔ بی جے پی کے ذرائع کا کہنا ہے کہ سازش کے تحت حکومت گرائی گئی اور اس طرح عوامی فیصلے کی بے احترامی کی گئی ہے۔ دراصل پارلیمنٹ میں ہونے والی بحث کو دور درشن پر دکھانے اور ریڈیو پر نشر کرنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ عوام کو دکھایا جائے کہ تمام پارٹیاں کس طرح حکومت گرانا چاہتی ہیں۔ باجپئی کی دونوں تقریریں بھی انتخابی تقریریں تھیں اور ان میں انہوں نے جس طرح موضوعات پر اظہار خیال کیا اور دوستو، دوستو کہہ کر خطاب کیا وہ خطاب ممبران پارلیمنٹ کے لیے نہیں بلکہ عوام کے لیے تھا۔

> بی جے پی نے جن آدیش یاترا اور ممبران کے دوروں سے پورے ملک کی فضا کو کشیدہ اور مکدر بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ممکن ہے کہ بال ٹھاکرے کی اس دھمکی پر بھی عمل کیا جائے جس میں انہوں نے خانہ جنگی کی بات کہی تھی۔ بی جے پی اس بات کو اچھی طرح سمجھ رہی ہے کہ جب تک فرقہ وارانہ ماحول نہیں بنے گا اسے مکمل اکثریت نہیں مل سکتی

اب بی جے پی نے ایک پروگرام بنایا ہے جس کے تحت پورے ملک میں یاترا نکالی جائے گی اور دونوں دن کی بحث کی ویڈیو دکھائی جائے گی۔ بی جے پی لیڈروں کا کہنا ہے کہ ہم خاموش نہیں بیٹھیں گے اور اس ایشو کو مرنے نہیں دیں گے۔ باجپئی کی تقریروں کے کیسٹ لاکھوں کی تعداد میں تیار کرائے جارہے ہیں جنہیں پورے ملک میں تقسیم کیا جائے گا۔ کلیان سنگھ کا کہنا ہے کہ بابری مسجد انہدام کا پورا سہرا ہم اپنے سر نہیں باندھ سکے تھے لیکن اس بار ہم یہ غلطی نہیں کریں گے اور عوام کو بتائیں گے کہ کس طرح آپ کے فیصلے کی بے توقیری کرکے بی جے پی حکومت گرادی گئی۔

استعفیٰ دینے کے فوراً بعد بی جے پی پارلیمانی پارٹی کی میٹنگ سے جس میں شیوسینا، سمتا پارٹی، اکالی دل اور ہریانہ وکاس پارٹی کے ممبروں نے بھی شرکت کی تھی، خطاب کرتے ہوئے باجپئی نے کہا کہ آپ لوگ اگلے الیکشن کی تیاری کریں۔ انہوں نے کہا کہ تمام ممبران پارلیمنٹ اپنے اپنے حلقے میں جائیں اور عوام کو بتائیں کہ کس طرح حکومت گرائی گئی۔ انہوں نے کہا کہ ہم نہیں چاہتے کہ وسط مدتی انتخاب ہو لیکن دیوگوڑا حکومت زیادہ دن نہیں چلے گی اور وسط مدتی انتخاب ناگزیر ہوجائے گا۔ اس لیے الیکشن سے پہلے پروگرام کے تحت آپ لوگ عوام میں جائیں اور ایسے حالات پیدا کریں جو الیکشن میں ہمارے مددگار ثابت ہوں۔

☆ بی جے پی لیڈران ——— چلو پھر عوامی عدالت میں

گویا بی جے پی نے جن آدیش یاترا اور ممبران کے دوروں سے پورے ملک کی فضا کو کشیدہ اور مکدر بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ممکن ہے کہ ٹھاکرے کی اس دھمکی پر بھی عمل کیا جائے جس میں انہوں نے خانہ جنگی کی بات کہی تھی۔

بی جے پی اس بات کو اچھی طرح سمجھ رہی ہے کہ جب تک فرقہ وارانہ ماحول نہیں بنے گا اسے مکمل اکثریت نہیں مل سکتی اس لیے وہ اب اپنے پرانے خول میں واپس جانا چاہتی ہے، باجپئی نے بھی اپنا اصل چہرہ دکھادیا ہے۔ جو بی جے پی اور آر ایس ایس کا اصل چہرہ ہے۔ اس طرح ممکن ہے کہ فسادات وغیرہ کرواکر اس حکومت کو بدنام کرنے اور نئے الیکشن کے حالات پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ بی جے پی کی یہی تیاری اور اس کے یہی عزائم ہیں۔

بقیہ: یہودی امن کے نہیں جنگ کے دلدادہ ہیں

ضروری نہیں ہے کہ پیریز کی طرح بنجامن بھی عرفات سے ملاقات کریں۔ ان سے رابطہ نیچے درجے کے اسرائیلی افسران کرسکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ عرفات کو ان کا مقام یاد دلانے کی ایک کوشش ہو یا ہوسکتا ہے کہ یہی نئی اسرائیلی حکومت کی پالیسی بھی ثابت ہو۔ بہرحال اتنی بات طے ہے کہ عرفات کے لیے مشکلات کا آغاز ہوچکا ہے۔ ایک طرف انہیں نئی انتہاپسند اسرائیلی حکومت سے مذاکرات میں دشواری پیش آئے گی جو آزاد فلسطینی مملکت کی سخت مخالف ہے اور دوسری طرف انہیں اردن کے شاہ حسین کی اس خواہش کا مقابلہ کرنا پڑے گا جس کا مقصد فلسطینی ریاست کے بجائے اردن اور فلسطین کی ایک فیڈریشن قائم کرنا ہے۔ نئے اسرائیلی وزیر اعظم اس خیال کے حامی ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کلنٹن کی پیریز کی کھلی حمایت کی وجہ سے دونوں ملکوں کے تعلقات میں سرد مہری آسکتی ہے۔ لیکن ایسی قیاس آرائیاں بے معنی ہیں۔ امریکہ اسرائیل کو تین ملین ڈالر سالانہ مدد دیتا ہے اور بین الاقوامی فورموں میں اس کی جا و بیجا حمایت کرتا ہے۔ گویا اسرائیل کے لیے امریکہ کو نظر انداز کرنا مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن ہے۔ دراصل امریکہ کا صدر کوئی بھی ہو، اسرائیل کا وزیر اعظم اسے پسند کرتا ہو یا نہ کرتا ہو، اسے ہر امریکی صدر سے اچھے تعلقات قائم رکھنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں کو یہ امید ہے کہ امریکہ نئی اسرائیلی حکومت پر دباؤ ڈال کر امن مذاکرات کے عمل کو جاری رکھنے پر مجبور کردے گا۔

امن مذاکرات کے عمل کے مستقبل کے مخدوش ہوجانے سے قطع نظر یہ بات بھی بہت اہمیت کی حامل ہے کہ حالیہ انتخاب سے اسرائیلی عوام کی ذہنیت کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ یہ سماج نہ صرف دو کیمپوں میں بٹا ہوا ہے بلکہ بنجامن نیتن یاہو کی فتح سے یہ بھی ثابت ہوجاتا ہے کہ یہودی امن کے بجائے جنگ کے دلدادہ ہیں۔

بقیہ آزاد کردستان کے لئے کردوں کی جنگ کیا گل کھلائے گی

عراقی علاقے سے ترکی کے خلاف حملے کررہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی کئی بار عراق کی سرحد میں داخل ہوکر کرد باغیوں پر حملہ کرچکا ہے۔ واضح رہے کہ عراق کا یہ علاقہ ۱۹۹۱ء سے اقوام متحدہ کی نگرانی میں ہے اور وہاں عراقی فوجوں کو کارروائی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

مغربی ممالک ایک آزاد کردستان کے حق میں نظر نہیں آتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ترکی کی سرزنش کرنے کے بجائے اس کی مدد کررہے ہیں۔ امریکہ نے حال ہی میں بلیک ہاک اور کوبرا ہیلی کوپٹر دیے ہیں جو باغیوں کے خلاف استعمال کیے جارہے ہیں۔ امریکہ کردوں کے خلاف جاسوسی سرگرمیوں میں بھی ملوث ہے اور ایسی خبریں وہ ترک حکومت کو دے دیتا ہے۔ ترکی کو اس وقت اسرائیل سے بھی مدد مل رہی ہے جس سے حال ہی میں اس نے ایک فوجی معاہدہ کیا ہے۔

لیکن ترکی کے باخبر حلقے اپنی حکومت کے ان اقدامات سے مطمئن نہیں ہیں۔ ان کے بقول حکومت کو فوجی کارروائی کے ساتھ مذاکرات کا دروازہ بھی کھلا رکھنا چاہیے۔ کیونکہ حقیقی امن کے لیے سیاسی گفتگو یا مصالحت ضروری ہے۔ ترکی کے نئے وزیر اعظم یسوت یلماز نے حال ہی میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا۔ لیکن وہ عملاً بھی ایسا کریں گے، یہ کہنا ابھی مشکل ہے۔ کیونکہ ترکی کا ہر نیا وزیر اعظم کرد مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایسے ہی وعدے کرتا ہے اور پھر بعد میں اسے بھول جاتا ہے۔

شری کرشنا کمیشن کی بحالی کے پیچھے راز کیا ہے؟

اٹل بہاری باجپئی نے بحیثیت وزیر اعظم مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ منوہر جوشی سے گذارش کی تھی کہ وہ بمبئی کے فسادات کی جانچ کرنے والے جسٹس شری کرشنا کمیشن کو پھر سے بحال کردیں۔ اور وزیر اعلیٰ نے اس حکم پر عمل درآمد کرتے ہوئے کمیشن کو بحال کردیا۔ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔ باجپئی نے یہ کام مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے کیا تھا۔ لیکن ان کی حکومت بھی چلی گئی، مسلمانوں کی ہمدردی بھی نہیں مل سکی اور شری کرشنا کمیشن بھی بحال ہوگیا۔

مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ نے اعلان کیا ہے کہ وہ کمیشن کی مدت میں چھ مہینے کی توسیع کررہے ہیں اور جنوری میں کمیشن کو اپنی رپورٹ پیش کردینی ہوگی۔ سیاسی مبصرین اس پر حیرت زدہ ہیں کہ شری کرشنا کمیشن کی متوقع رپورٹ سے خائف وزیر اعلیٰ نے پھر یہ کمیشن کیسے بحال کردیا کیا اب شیوسینا کے غنڈوں اور پولیس والوں کو اس میں مورد الزام نہیں ٹھہرایا جائے گا۔ بی جے پی اور شیوسینا کی عیاریوں پر گہری نظر رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ منوہر جوشی ایسا کچھ اقدام کرنا چاہتے ہیں کہ رپورٹ میں شیوسینا پر زیادہ ضرب نہ آئے۔ اس کے لیے ان کی پوری کوشش ہے کمیشن کے سربراہ کو بدل دیا جائے یا اس میں مزید دو ایک ججوں کا اضافہ کردیا جائے۔ وہ ایسے لوگ ہوں جو شیوسینا سے ہمدردی رکھتے ہوں اور اگر شیوسینا کے بچاؤ میں رپورٹ تیار نہ ہوسکے تو کم از کم دو متضاد رپورٹیں پیش ہوں جیسا کہ بھاگلپور فساد کی جانچ کے سلسلے میں ہوا ہے۔ یعنی ایک رپورٹ اگر سربراہ کی ہو تو دوسری رپورٹ دوسرے ارکان کمیشن کی ہو جو شیوسینا کے دفاع میں ہو۔ بہرحال یہ قیاس آرائی کہاں تک صحیح ہے اس پر ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

دوروزہ بحث کے دوران

پارلیمنٹ میں بابری مسجد اور مسلم مسائل کی گونج

"وزیر داخلہ مرلی منوہر جوشی نے صحیح کہا کہ یہ سب کچھ اور نہیں بلکہ نظریات کی لڑائی ہے خود وزیر اعظم باجپئی بابری مسجد انہدام کے پیچھے کسی سازش کے رول کی تردید کرچکے ہیں۔ وہ کہہ چکے ہیں کہ مسجد منہدم کرنے والوں کو سزا دی جانی چاہئے۔ لیکن اسی پارٹی کے کچھ دوسرے لیڈروں نے کچھ ہی دنوں بعد کہنا شروع کردیا کہ انہیں مسجد گرانے والوں پر فخر ہے۔ واضح رہے کہ اس پارٹی کے لیڈر الگ الگ وقتوں میں الگ الگ باتیں کہتے ہیں۔ ملک کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس پارٹی کی اصل آواز کون سی ہے؟ خود باجپئی بھی رنگ بدلتے رہے ہیں۔ آسام میں ۱۹۸۳ کے انتخابات میں انتخابی مہم کے دوران انہوں نے عوامی جلسوں میں کہا تھا کہ "غیر ملکی یہاں آگئے ہیں لیکن کوئی کچھ نہیں کررہا ہے۔ یہ لوگ پنجاب میں گھسے ہوتے تو لوگ انہیں کاٹ کر پھینک دیتے۔" باجپئی کی اشتعال انگیز تقریروں کے بعد ہی آسام میں نیلی کا قتل عام ہوا۔ میں گولوالکر کی ایک کتاب کا حوالہ دیتا ہوں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ غیر ہندوؤں کو ہندو تہذیب اور زبان ہی

اختیار کرنی ہوگی۔ انہیں ہندوؤں کے زیر حلم رہنا ہوگا۔ میں اس نظریہ کی سخت مخالفت کرتا ہوں۔"

مذکورہ اقتباس پارلیمنٹ میں ہوئی بحث میں مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر اندرجیت گپتا کی معرکتہ الآراء تقریر کا ہے۔ جس میں انہوں نے بی جے پی اور اس کے نظریات کی دھجیاں بکھیر دیں اور بابری مسجد اور مسلمانوں کا مسئلہ اٹھایا ہو۔ ایسے متعدد مقررین تھے جنہوں نے ان دونوں مسائل کو اٹھا کر بی جے پی کی کڑی نکتہ چینی کی اور کہا کہ یہ ایک سیکولر ملک ہے اسے فاشسٹ ملک نہیں بننے دیا جائے گا۔ گویا بابری مسجد شہید ہوکر بھی زندہ ہے اور اس کے انہدام کا آسیب بی جے پی لیڈروں اور ان کی حکومت کا پیچھا کررہا ہے اور آئندہ بھی کرتا رہے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ بی جے پی کی حمایت میں کوئی ایک بھی ممبر نہیں تھا۔ معاملہ یہ ہے کہ اس کی پیشانی

> گویا یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ مسلمانوں کی سیاسی اہمیت ابھی بھی اپنی جگہ پر مسلم ہے اور کوئی بھی سیاسی پارٹی (بی جے پی کو چھوڑ کر) مسلمانوں کو نظر انداز کرنے کی جرآت نہیں کرسکتی۔ مسلمان پہلے بھی سیاستدانوں کے ذہن و دماغ پر چھائے ہوئے تھے اور آج بھی چھائے ہوئے ہیں۔

پر بابری مسجد کی شہادت اور مسلم کش فسادات کا کلنک لگا ہوا ہے۔ اس لئے کسی بھی رکن نے اسے گلے لگانا پسند نہیں کیا۔

بحث کے دوران اکثر و بیشتر مسلمانوں کا مسئلہ اٹھایا گیا اور بی جے پی پر مسلم دشمنی کا الزام لگاکر یہ بتانے کی کوشش کی گئی کہ اگر یہ حکومت رہ گئی تو مسلمانوں کے ساتھ بڑا ظلم ہوگا۔ متعدد ممبران کی اس الزام تراشی پر بالآخر باجپئی جھنجلاگئے اور اپنی جوابی تقریر میں کہہ دیا کہ لوگوں کو صرف سب سے بڑی اقلیت یعنی مسلمانوں کی فکر رہتی ہے وہ اقلیت جو دو فیصد ہے یعنی سکھ، ان کی کسی کو پروا نہیں ہے۔ باجپئی نے یہ بھی کہا کہ بہت سے اراکین پارلیمنٹ ہمارے ساتھ آنے کو تیار تھے لیکن انہیں خطرہ تھا کہ ان کے ہاتھ سے مسلم ووٹ نکل جائے گا۔ مسلمان ان سے ناراض ہوجائیں گے۔ یعنی انہوں نے مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے بی جے پی کے ساتھ آنا پسند نہیں کیا۔ گویا یہ بات ثابت ہوگئی کہ مسلمانوں کی سیاسی اہمیت ابھی بھی اپنی جگہ پر مسلم ہے اور کوئی بھی سیاسی پارٹی (بی جے پی کو چھوڑ کر) مسلمانوں کو نظر انداز کرنے کی جرات نہیں کرسکتی۔ مسلمان پہلے بھی سیاستدانوں کے ذہن و دماغ پر چھائے ہوئے تھے اور آج بھی چھائے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ مسلمان اس صورتحال سے فائدہ اٹھائیں اور ایسی حکمت عملی اختیار کریں کہ سیاسی پارٹیاں ان کے مطالبات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوجائیں۔

سیاسی پارٹیوں کو صرف مسلمانوں کی

ہندو اکثریت میں ہونے کے باوجود احساس

باجپئی حکومت کی تحریک اعتماد پر پارلیمنٹ میں ہوئی دو دن کی بحث انتہائی دلچسپ، معلوماتی اور اہمیت کی حامل رہی ہے۔ اس بحث میں باجپئی سے متعلق اکثر مقررین نے کہا کہ وہ بذات خود بہت اچھے انسان ہیں مگر غلط صحبت میں پڑگئے ہیں۔ ممبران نے ان کی انفرادی تعریف کرتے ہوئے ان کی پارٹی کی پالیسیوں اور حکومت سازی کے عمل کی سخت مذمت کی۔

باجپئی کی افتتاحی اور اختتامی جس میں انہوں نے بحث کا جواب دیا دونوں تقریریں ان کی ظاہری شخصیت سے مختلف تھیں یا یوں کہیے کہ بی جے پی کی پالیسیوں اور نظریات سے ذرا ہٹ کر تھیں۔ انہوں نے حکومت سازی کے بعد صدارتی خطبے میں بی جے پی کے انتخابی ایجنڈوں جیسے رام مندر، یکساں سول کوڈ، دفعہ ۳۷۰ کا خاتمہ وغیرہ کو شامل نہ کرکے ایک طرح سے یہ تاثر دیا تھا کہ وہ حکومت کی خاطر کچھ بھی قبول کرنے کو تیار ہیں۔ لوگوں کا کہنا بھی یہی ہے کہ باجپئی یا بی جے پی نے اقتدار کی خاطر اپنی پالیسیوں کو ترک کردیا۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ باجپئی جیسا آر ایس ایس کا وفادار کارکن یہ کیسے برداشت کرسکتا ہے کہ بی جے پی کی حکومت اپنے بنیادی نظریات کو خیرباد کہہ دے اور محض اقتدار کی خاطر انحراف کی راہ اختیار کرلے۔ دراصل یہی آر ایس ایس کا اصل چہرہ تھا۔ سنگھ پریوار کا ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ بوقت ضرورت اپنے اصل چہرے پر پردہ ڈال لو اور فریب سے کام لے کر اپنا الو سیدھا کرو۔ باجپئی کا نسبتاً سیکولر اور لبرل چہرہ دراصل آر ایس ایس کے "نظریہ فریب دہی" کا اصل چہرہ ہے۔ سنگھ باجپئی کو سامنے کرکے عوام کو اچھی طرح بیوقوف بنانے کا فن جانتا ہے۔

ذیل میں باجپئی کی دونوں تقریروں کے وہ اہم حصے جو مسلمانوں سے تعلق رکھتے ہیں پیش کیے جارہے ہیں تاکہ اس کی روشنی میں قارئین بی جے پی اور باجپئی کی اصل صورت کو پہچان سکیں۔ بظاہر ان کی باتیں بہت سیدھی سادی اور دل میں اتر جانے والی لگتی ہیں لیکن اگر بین السطور کی گہرائی میں جاکر اور الفاظ کی روح میں اتر کر معانی و مطالب کی تلاش کی جائے تو عین وہی باتیں سامنے آئیں گی جو آر ایس ایس کے دوسرے لیڈران کہتے رہتے ہیں۔

یکساں سول کوڈ

یکساں سول کوڈ کا ذکر کرتے ہوئے باجپئی نے کہا کہ یکساں سول کوڈ کی وکالت کی ایک وجہ ہے اور اسی وجہ سے ان کی پارٹی کو فرقہ پرست قرار دیا جارہا ہے۔ آئین سازوں نے شادی وغیرہ کے لیے ایک قانون کی بات کہی۔ یہی بات سپریم کورٹ نے بھی دوہرائی۔ کیا یہ دونوں فرقہ پرست نظریات کے تحت تھے۔ جب ملک میں فوجداری قانون ایک ہوسکتا ہے تو شہری قانون ایک کیوں نہیں ہوسکتا؟ اسلامی ممالک میں انفرادی قوانین بدل رہے ہیں۔ اگر یہاں مسلمانوں کو کوئی دقت ہے تو وہ کہیں کہ ان کے معاشرے کو تیار کرنے کے لیے تھوڑا وقت چاہیے۔

بنگلہ دیش سے نام نہاد دراندازی کا ذکر کرتے ہوئے باجپئی نے کہا کہ غیر قانونی ڈھنگ سے آنے والوں کی مخالفت سیاسی پارٹیوں کو پسند نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ کوئی بھی ملک

اتنی بڑی تعداد میں دراندازی کیسے برداشت کرسکتا ہے؟ اس پر ایک متفقہ رائے بننی چاہیے

کیا وزیر اعظم دیو گوڑا آ

کیا وزیر اعظم ایچ ڈی دیوگوڑا فاشسٹ آر ایس ایس کے مداح ہیں؟ کیا انہوں نے آر ایس ایس کی "خدمات" کا اعتراف کیا ہے؟ کیا انہوں نے اس تنظیم کی شان میں تعریفوں کے پل باندھے ہیں اور کیا دوسرے لیڈران بھی آر ایس ایس کے مداح ہیں؟ یہ سوالات پارلیمنٹ میں بحث کے دوران باجپئی کے انکشاف کے بعد پیدا ہورہے ہیں ایوان میں اس وقت زبردست شور شرابہ اور ہنگامہ ہوا جب انہوں نے کہا کہ ایک طرف آر ایس ایس کی مذمت کی جارہی ہے اور دوسری طرف متحدہ محاذ کے لیڈر اور وزیر اعظم بننے جارہے دیوگوڑا خود آر ایس ایس کی تعریف کرچکے ہیں۔

دو دن کے بعد بی جے پی کے جنرل سکریٹری وینکیا نائیڈو نے دیو گوڑا کی تقریر کا اقتباس بھی جاری کیا جس میں انہوں نے بتایا کہ یہ پروگرام ایمرجنسی کی بیسویں سال گرہ پر بنگلور میں ہوا تھا جس میں ارون شوری، رام کرشن ہیگڑے اور آڈوانی نے بھی شرکت کی تھی۔ اپنی تقریر میں دیوگوڑا نے کہا تھا کہ "ایمرجنسی کے حوالے سے آر ایس ایس کے رول کا جہاں تک تعلق ہے میں ارون شوری کے خیال سے متفق ہوں۔ اپنی چالیس سالہ عوامی زندگی میں میں نے آر ایس ایس کے خلاف کبھی کچھ نہیں کہا۔ میں نے آر ایس ایس کے رول کی کبھی نکتہ چینی نہیں کی۔ سیاسی پارٹیوں سے متعلق میرے اپنے خیالات ہیں۔ آر ایس ایس ایک ایسی تنظیم ہے

اپنے قارئین سے..

اس بات سے تو آپ بھی اتفاق کریں گے کہ اردو ملک بھر کے مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ جنوب میں مختلف علاقائی زبانوں کا غلبہ ہے تو شمال کے اہم صوبوں میں بھی صورت حال مختلف نہیں۔ خود یوپی میں نئی نسل اردو زبان سے نا آشنا ہے۔ ملی ٹائمز یوروپ اور امریکہ کے جن مسلم گھروں میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے وہاں بھی نئی نسل اس زبان سے واقف نہیں۔ ابتدا سے ہی مختلف حلقوں سے یہ اصرار ہوتا رہا ہے کہ ملی ٹائمز کی کھڑکیاں غیر اردو داں مسلمانوں کے لیے بھی کھول دی جائیں۔

ملی ٹائمز کسی مخصوص لسانی تہذیب کا علمبردار نہیں بلکہ ایک ایسے انقلابی پیغام کو عام کرنا چاہتا ہے جس کا

اس شمارے کی قیمت پانچ روپے
سالانہ چندہ ایک سو روپے / چالیس امریکی ڈالر
یکے از مطبوعات
مسلم میڈیا ٹرسٹ
پرنٹر پبلیشر، ایڈیٹر محمد احمد سعید نے
تیج پریس بہادر شاہ ظفر مارگ سے چھپواکر
دفتر ملی ٹائمز انٹر نیشنل
۴۹، ابوالفضل انکلیو
جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا
فون نمبر۔ ۶۸۲۷۰۱۸ فیکس۔ ۶۹۲۶۰۳۰
سری نگر بذریعہ ہوائی جہاز ساڑھے پانچ روپے

...ں کی فکر رہتی ہے-شکست خوردہ باجپئی کا شکوہ

...ساس کمتری میں مبتلا ہوتے جارہے ہیں

...لفت سیاسی پارٹیوں کو
...نے کہا کہ کوئی بھی ملک

-بی جے پی کو فرقہ پرست کہے جانے پر بھی باجپئی نے اپنی ناراضگی ظاہر کی اور کہا کہ حکومت فرقہ

...ندازی کیسے برداشت
...متفقہ رائے بننی چاہیے

...پرست نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ شاہ بانو معاملے میں ایک رائے بن سکتی تھی۔ لیکن ایسا

نہیں کیا گیا۔ باجپئی نے کہا کہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ملک میں ہندو اکثریت میں ہونے کے باوجود احساس کمتری میں بتلا ہیں۔ اس کی وجوہات کا پتہ لگانا چاہیے۔ کشمیر سے بڑی تعداد میں ہندو اور مسلمان آئے ہیں وہ بھی ہندوستان کے شہری ہیں ان کے لیے کوئی نہیں بولتا ہے بی جے پی بولتی ہے تو اسے فرقہ پرست قرار دیا جاتا ہے۔

صرف مسلمانوں کی فکر ہے

بحث کا جواب دیتے ہوئے مسلمانوں کے تعلق سے باجپئی نے کہا کہ کچھ لوگوں نے ہماری حمایت اس لیے نہیں کی کہ مسلم ووٹ ان سے کٹ جاتا۔ قابل غور بات ہے کہ یہ ووٹوں کی سیاست کہاں تک جائے گی۔ کیا اس کے آگے ملکی مفاد صفر ہو کر رہ جائے گا۔ ہم اقلیتوں کو مساوی حقوق دینے کی بات کرتے ہیں تو ہم پر الزام لگتا ہے کہ ہم اپنے وعدے پر عمل نہیں کرتے۔ آپ مرکز میں ہماری حمایت کرکے دیکھیں کہ ہم تمام باتوں کو عملی جامہ پہنادیں گے۔ جب اقلیتوں کی بحث ہوتی ہے تو یہ بڑی عجیب بات ہے کہ سب سے بڑی اقلیت یعنی صرف مسلمانوں کی ہی فکر کی جاتی ہے۔ سکھوں کے درد کو کوئی نہیں دیکھتا۔ انہوں نے کہا کہ میرے دوست ملائم سنگھ اس سلسلے میں نہ بولیں تو بہتر ہے۔ ان کی حکومت میں جس طرح اترانچل کی خواتین کے ساتھ زنا بالجبر کیا گیا وہ شرمناک ہے۔ اب میرا منہ بند کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ انہوں نے دھمکی آمیز انداز میں کہا کہ میں کہنا چاہتا ہوں کہ تعداد کی بنا پر ایسا کرنے

کی کوشش کریں گے تو خیالات ونظریات کی لڑائی ہمیں ایوان سے باہر لے جانے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ ملک میں فرقہ واریت یا ذات پات کی بنیاد پر گول بندی نہیں ہونی چاہیے۔

دیو گوڑا اور آر ایس ایس

آر ایس ایس کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس بحث میں ایسی تنظیم کو بھی گھسیٹنے کی کوشش کی جارہی ہے جو کہ آزاد ہے۔ میرا مطلب آر ایس ایس سے ہے۔ اس کے نظریات سے کسی کو بھی اختلاف ہوسکتا ہے۔ لیکن یہاں اس پر جس طرح کے الزامات لگائے جارہے ہیں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ لوگوں کے دلوں میں اس کے تعمیری کام کے لیے اس کی عزت ہے۔ متحدہ محاذ کے لیڈر اور وزیر اعظم کے عہدے کے امیدوار دیو گوڑا خود اس کی ستائش کرچکے ہیں۔ بنگلور میں آر ایس ایس کے پروگرام میں انہوں نے جو کہا تھا وہ کئی اخباروں میں شائع ہوا تھا۔ اس ملک کے وہ لوگ جو ملک کا بھلا چاہتے ہیں آر ایس ایس کے رابطے میں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ تنظیم ملک کی خدمت میں مصروف ہے۔ چینی حملے کے بعد پنڈت نہرو نے جن رضا کار تنظیموں کو مدد کے لیے بلایا تھا ان میں ایک آر ایس ایس بھی تھی۔ لیکن اس میں کمیونسٹ نہیں تھے۔ لال بہادر شاستری کے وقت میں پاکستانی حملے کے بعد آر ایس ایس نے ملک کا نظم ونسق سنبھالا تھا۔ (دراصل اسی زمانے میں نظم ونسق سنبھالنے کی آڑ میں آر ایس ایس نے اپنے آدمیوں کو تمام سرکاری کلیدی عہدوں پر فائز کروادیا تھا)

...وڑا آر ایس ایس کے پرانے مداح ہیں

...ی شرکت کی تھی۔ اپنی
...تھا کہ۔ ایمرجنسی کے
...ے رول کا جہاں تک
...ں کے خیال سے متفق
...وامی زندگی میں میں نے
...کبھی کچھ نہیں کہا۔ میں
...رول کی کبھی نکتہ چینی
...ے متعلق میرے اپنے
...ں ایک ایسی تنظیم ہے

جس پر کوئی سیاہ دھبہ نہیں ہے جب کہ تمام سیاسی پارٹیاں داغدار ہیں۔ یہ بات میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔" نائیڈو نے کہا کہ دیو گوڑا نے آج تک اس کی تردید نہیں کی اور ہمیں خوشی ہوگی اگر وہ اس کی وضاحت کریں گے۔

یہ بات بہت حد تک صحیح لگتی ہے کہ زیادہ تر لیڈران آر ایس ایس کے رابطے میں ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ دوسری پارٹیوں کے لیڈر بھی آر ایس ایس کی اس طرح مخالفت نہیں کرتے جس طرح کرنی چاہیے اور نرسمہا راؤ اور کچھ دوسرے لیڈروں کے بارے میں بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ ان کے آر ایس ایس سے کیسے مراسم ہیں۔ دراصل یہ سارے لوگ ایک ہی تھیلے کے چٹے بٹے ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کون لیڈر آر ایس ایس سے وابستہ ہے اور کون نہیں۔ حقیقت واقعہ تو یہ ہے کہ زیادہ تر لیڈران جو کہ اس وقت حکومت میں ہیں یا جن کا حکومت بنانے میں اہم رول رہا ہے آر ایس ایس کے مداح ہیں۔

...کے لیے بھی کھول
...مخصوص لسانی
...ہیں بلکہ ایک ایسے
...نا چاہتا ہے جس کا

مخاطب ہر انسان ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مختلف زبانوں میں ان خیالات کی اشاعت کے لیے علیحدہ علیحدہ اخبارات جاری کیے جاتے اور دنیا کے واقعات کو صحیح تناظر میں دیکھنے اور دکھانے کا یہ سلسلہ کہیں زیادہ منظم انداز سے جاری رہتا۔ لیکن ہم جیسے انسانوں کے لیے جن کے دل ودماغ انقلابی خیالات سے معمور لیکن جیب پیسوں سے خالی ہو سر دست ایسا ممکن نہیں۔ خیال آیا کیوں نہ اپنے اردو قارئین سے ایک صفحہ مستعار لیا جائے اس طرح ہمارا انقلابی پیغام پہلے سے کہیں زیادہ ہاتھوں میں پہونچ سکے گا اور آپ کو صرف ایک صفحے کی قربانی دینی ہوگی۔ اگر آپ اس مشن کی آبیاری کے لیے ایک صفحے کے عطیے پر آمادہ ہیں تو ہم آئندہ بھی اس سلسلے کو جاری رکھیں گے۔ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔

(ادارہ)

ملائم سنگھ بی جے پی کی

خفیہ فائلوں کی ہٹ لسٹ پر

تیرہ روزہ اپنے دور میں بی جے پی حکومت کے زیادہ تر وزراء نے صرف ایک کام کیا اور وہ بھی خاص تندہی کے ساتھ۔ وہ کام تھا خفیہ رپورٹوں کی فائلوں کی فوٹو کاپی کروانا۔ بی جے پی کے لیڈروں کو معلوم تھا کہ یہ حکومت چلنے والی نہیں ہے اس لیے وزراء نے اہم دستاویزات کی نقول حاصل کرلی ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ آج بی جے پی ہیڈ آفس میں اہم سرکاری رپورٹوں کی نقول احتیاط اور حفاظت سے جمع کردی گئی ہیں۔ ان میں سب سے اہم فائل سماجوادی پارٹی کے لیڈر ملائم سنگھ یادو سے

> بی جے کا اصل نشانہ ملائم سنگھ یادو ہیں انٹلی جنس بیورو کی ایک رپورٹ میں ایسا تاثر دیا گیا ہے کہ ملائم کے "مسلم انتہاپسندوں" سے گہرے روابط ہیں۔ یہ رپورٹ ایرانی سفارت خانہ میں ملائم کے دو دوروں پر مشتمل ہے۔ لیکن اس میں ملائم کے خلاف کوئی کیس نہیں بن پارہا ہے

متعلق ہے۔ بی جے پی نے کئی لوگوں کو اپنا ہدف بنایا ہے۔ ان میں سر فہرست ملائم سنگھ ہی ہیں۔ ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی ہیں جو حوالہ میں

ابراہیم سے متعلق ایک فائل کی بھی زیروکس کاپی کروائی گئی ہے۔ ۶ دسمبر ۹۲ سے متعلق دستاویزات بھی بی جے پی نے اپنے قبضے میں کرلی ہیں۔ حالانکہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ اس سلسلے میں کامیاب نہیں ہوسکتی ہے۔ این ڈی تیواری، شرد یادو اور ایس آر بومئی سے متعلق فائلیں بھی بی جے پی کے پاس آگئی ہیں۔ سکھ رام اور ستیش شرما بھی اس لسٹ میں شامل ہیں۔

لیکن بی جے پی کا اصل نشانہ ملائم سنگھ یادو ہیں انٹلی جنس بیورو کی ایک رپورٹ میں ایسا تاثر دیا گیا ہے کہ ملائم کے "مسلم انتہاپسندوں" سے گہرے روابط ہیں۔ یہ رپورٹ ایرانی سفارتخانہ میں ملائم کے دو دوروں پر مشتمل ہے۔ لیکن اس میں ملائم کے خلاف کوئی کیس نہیں بن پارہا ہے۔ کیونکہ دونوں دوروں کے دوران ایسا کوئی سراغ نہیں ملا کہ پیسوں کا لین دین ہوا ہو۔ بی جے پی ملائم کا رشتہ پاکستان کی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی سے بھی جوڑنا چاہ رہی ہے۔ گویا وہ ملائم کو ہر قیمت پر عوام میں بدنام کردینا چاہتی ہے۔ بہرحال بی جے پی کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہوئی کہ اس نے اہم سرکاری اور خفیہ

ملوث رہے ہیں اور دیو گوڑا حکومت میں وزیر ہیں۔ بی جے پی حکومت کے وزیر داخلہ مرلی منوہر جوشی نے اس سلسلے میں زیادہ چابکدستی اور مہارت کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے سورج منڈل رشوت کیس میں سابق وزیر اعظم نرسمہا راؤ کے متوقع رول کی کافی چھان بین اور تلاش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔

محکمہ انٹلی جنس کے ایک افسر کا کہنا ہے کہ بی جے پی کے نشانے پر شرد پوار، ملائم سنگھ یادو، رام ولاس پاسوان اور احمد پٹیل ہیں۔ داؤد

دستاویزات اور فائلوں کی نقول حاصل کرلیں اور اب ان میں سے شواہد ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے حریفوں کے خلاف استعمال کرے گی۔

•

”تم پہلی گولی روک نہیں سکتے مگر دوسری لیڈر کو نہیں تمہیں لگنی چاہیے“

ہندوستان کی وی آئی پی سیکورٹی کی ناپختگی اور مغربی ممالک کی منظم سیکورٹی کا ایک جائزہ

مسٹر اٹل بہاری باجپئی کے وزیر اعظم بنتے ہی ان کی رہائش کی طرف جانے والی سڑک پر درجنوں پولیس مینوں کو تعینات دیکھا جانے لگا ہے۔ ہندوستان میں وی وی آئی پی سیکورٹی میں نمائشی پن غالب ہے۔ اس کا برتاؤ واضح طور پر جارحانہ ہوتا ہے۔ گذشتہ وزراء اعظم کی طرح مسٹر باجپئی کے ارد گرد بھی کئی اسٹین گن بردار بلیک کیٹ محافظوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وی وی آئی پی سیکورٹی کو ذہانت اور منظر کارکردگی کی زیادہ ضرورت ہے نہ کہ طاقت کے مظاہرے کی۔

جب ہم ٹیلی ویژن پر امریکی صدر بل کلنٹن کو کہیں باہر نکلتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ان کے ہمراہ کوئی اسٹین گن بردار محافظ نہیں ہوتے۔ بے شک ان کی سکرٹ سروس کے ایجنٹ آس پاس موجود رہتے ہیں لیکن ان کی شناخت نہیں ہو سکتی اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ ایجنٹ مسٹر کنٹن کے ارد گرد کے افراد سے مختلف نہیں ہوتے بلکہ عمدہ سوٹوں میں ملبوس یہ لوگ مجمع کا ہی حصہ بن جاتے ہیں۔ لیکن کسی ہندوستانی وزیر اعظم کو خواہ ٹی وی پر دیکھیں یا حقیقی زندگی کی کسی سچویشن میں کئی مسلح محافظین اسٹین گن تانے انہیں گھیرے ہوئے مل جائیں گے گویا کب انہیں کوئی خیالی حملہ آور یا قاتل مل جائے اور وہ اسے ڈھیر کردیں۔

بیشتر اوقات وزیر اعظم کے پاس کسی بلیک کیٹ کی موجودگی کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ مثال کے طور پر اگر وزیر اعظم کی کسی تقریب میں مدعو افراد میٹل ڈیٹکٹر سے گذارے جاچکے ہیں تو پھر کیا ضرورت رہ جاتی ہے کہ مسلح محافظ ان سے چمٹے رہیں۔ لیکن انہیں تو اسی طرح چمٹے رہنا ہے کیونکہ وی وی آئی پی کی بندھی ٹکی مشق پر اس ملک میں کبھی انگشت نمائی ہوتی ہی نہیں ہے کیونکہ اس سے متعلق ایک حد درجہ خفیہ نیلی کتاب کے ذریعہ جاری کیے جاتے ہیں جس کے مشمولات پر نہ کبھی نظر ثانی کی جاتی ہے نہ وقتاً فوقتاً درپیش ضروریات کے مطابق ان میں کوئی ترمیم ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اندرا گاندھی قتل کے مقدمے کی کارروائی بھی کمرہ کے سامنے ہوئی جس کا مقصد یہ یقین دہانی کرانا تھا کہ وی وی آئی پی سیکورٹی کی مقررہ مشق عوام کے علم میں کسی اہم شخصیت کے قتل کے لیے حملہ آور کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا۔

تاہم اپنی تمام تر قوت کے مظاہرے کے ہندوستان میں وی وی آئی پی سیکورٹی صورت حال قابل افسوس ہے۔ خیال کیجیے اس واقعہ کا جو ۲ اکتوبر ۱۹۸۶ کو اس زمانے کے وزیر اعظم راجیو گاندھی کو راج گھاٹ پر پیش آیا۔ جھاڑیوں میں چھپے ہوئے کرن جیت سنگھ نے ان پر گولی چلادی تھی۔ جب گولی چلی تو ان کے باڈی گارڈوں نے کچھ نہ کیا۔ وہ یہی سمجھے کہ یہ کسی پٹاخے یا کسی اسکوٹر کے مس فائر کی آواز تھی۔ ان کے اس مفروضہ نے کرن جیت سنگھ کو دوسری گولی چلانے کا موقع دے دیا اور یہ مسٹر راجیو گاندھی کی خوش قسمتی ہی تھی کہ گولی ان کے نہیں لگ سکی۔

اب ذرا مسٹر راجیو اور دوسری شخصیات کے محافظوں کی کارکردگی اور امریکی سکرٹ سروس ایجنٹوں کو دی جانے والی تربیت کا موازنہ کیجیے۔ ان کے معلمین انہیں یہ سکھاتے ہیں کہ حملہ آور کی بندوق سے چلنے والی پہلی گولی کو تو کبھی روکا ہی نہیں جاسکتا۔ لیکن دوسری صدر کو نہیں بلکہ تمہیں لگ سکتی ہے۔ یہ تربیت امریکی سکرٹ سروس کے ایجنٹوں کی مشق کا ایسا اہم جزو ہے کہ جب جان کنیڈی پر ۱۹۶۳ میں فائر ہوا تو نائب صدر لینڈن جانسن کنیڈی کے پیچھے تیسری کار میں بیٹھے تھے جوں ہی پہلی گولی چلی جانسن کے ایجنٹ نے لیموزین کے فرش پر جلدی سے انہیں منہ کے بل گرادیا اور انہیں اپنے پورے جسم سے ڈھک لیا۔ بعد میں جانسن نے اس ایجنٹ کی حاضر دماغی کی تعریف کی۔ اسی طرح کی مستعدی کا مظاہرہ امریکی سکرٹ سروس کے ایجنٹوں نے اس وقت کیا تھا جب مسٹر جیری فورڈ کو دوبار اور رونالڈ ریگن کو ایک بار جان سے مارنے کی کوشش کی گئی۔ ایجنٹوں نے ان کے لیے منتظر لیموزین میں انہیں بٹھانے سے پہلے ان دونوں کے اوپر خود کو گرا کر انہیں بچالیا۔

> جب جان کنیڈی پر ۱۹۶۳ میں فائر ہوا تو نائب صدر لینڈن جانسن کنیڈی کے پیچھے تیسری کار میں بیٹھے تھے۔ جوں ہی پہلی گولی چلی جانسن کے ایجنٹ نے لیموزین کے فرش پر جلدی سے انہیں منہ کے بل گرادیا اور انہیں اپنے پورے جسم سے ڈھک لیا۔ بعد میں جانسن نے اس ایجنٹ کی حاضر دماغی کی تعریف کی۔

ہندوستان کی وی وی آئی پی سیکورٹی زیادہ تر لوگوں کے آرام و سکون میں مخل ہوتی ہے۔ جس سڑک سے وزیر اعظم کو گزرنا ہو وہ خالی کرائی جاتی ہے۔ مثلاً ابھی حال ہی میں پریس کلب آف انڈیا کے پاس کار پارک کرنا ممنوع کر دیا تھا جب کہ وہ مسٹر باجپئی کی رہائش گاہ سے خاصی دوری پر ہے۔ یہاں تک کہ اگر آتش گیر مادے سے بھری ہوئی پوری کار میں پریس کلب کے باہر دھماکہ ہو تو بھی مسٹر باجپئی کو ذرہ برابر بھی نقصان نہیں ہو گا۔ ہمارے ملک میں وی وی آئی پی سیکورٹی کی آنکھ بھی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ٹی وی پروگرام میں باجپئی صاحب اس بات پر خاصے برہم ہوئے تھے کہ یہ بری تکلیف دہ بات تھی کہ ان کے مخالفین آہنی باڑھ کھڑی کر رہے تھے جس سے دس سال کے شناسا پارٹی ورکروں سے بھی نہیں مل سکے۔ شاید مسٹر باجپئی کو نہیں معلوم کہ ہمارے یہاں اس طرح کی لایعنی سیکورٹی بالکل غیر ضروری ہے۔ حفاظت کی طرف سے دنیا کی سب سے زیادہ چوکنا حکومت اسرائیل کی ہے۔ راقم السطور نے سی این این ٹی وی نیٹ ورک پر مقتول اسرائیلی وزیر اعظم اسحاق رابن کے جنازے کی پوری تفصیل براہ راست دیکھی تھی جس میں دنیا کے معروف رہنماؤں نے شرکت کی تھی۔ اس ایک گھنٹہ کی تقریب میں سوٹ میں ملبوس ایک شخص بھی تو ایسا نہیں تھا جسے امریکی سکرٹ سروس ایجنٹ کا ہم پیشہ کہا جاسکے۔ ہماری حکومت کو احساس ہونا چاہیے کہ ایک معیاری اور مؤثر وی وی آئی پی سیکورٹی وہی ہوتی ہے جو جبری دست اندازی کا تاثر نہ دے۔

> ہندوستان کی وی وی آئی پی سیکورٹی زیادہ تر لوگوں کے آرام و سکون میں مخل ہوتی ہے۔ جس سڑک سے وزیر اعظم کو گزرنا ہو وہ خالی کرائی جاتی ہے۔ ہماری حکومت کو احساس ہونا چاہیے کہ ایک معیاری اور مؤثر وی وی آئی پی سیکورٹی وہی ہوتی ہے۔ جو جبری دست اندازی کا تاثر نہ دے۔

بقیہ: مصر میں غربت و افلاس

لیکن اس کے باوجود مسلح جنگ جوؤں کی تعداد میں کمی واقع نہیں ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ حکومت کے اعلان کردہ دہشت گرد دراصل نصف سے زیادہ غریبی لائین سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کے ترجمان ہیں کیونکہ وہ ان کے مسائل کو اسلام کی روشنی میں حل کرنے کی بات کرتے ہیں۔ مصری حکومت انہیں دہشت گرد قرار دے کر مغرب کی حمایت تو حاصل کر سکتی ہے لیکن ملک میں شاید امن قائم نہ کر سکے۔ دراصل اسے امن قائم کرنے کے لیے ان گنت لوگوں کے مسائل کو حل کرنا ہو گا جو اس کی ناعاقبت اندیشانہ معاشی پالیسیوں کی وجہ سے انتہائی غربت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ ☆☆☆☆☆

توجہ دونوں طرف سے ہونی چاہیے۔ ہر ماں کی طرح خط میں مذکور ساس صاحبہ کی بھی خواہش ہوگی کہ ان کے بیٹا اور بہو خوش و خرم زندگی گذاریں۔ ان سے نسل چلے تو دوسروں کی بیٹی کو بھی اپنی بیٹی کی جگہ تصور کریں۔ شوہر صاحب کو معلوم ہو کہ کب تک منے میاں بنے رہیں گے اور اپنی ذمہ داری کو نہیں سمجھیں گے۔

بقیہ: آپ کی الجھنیں

کے بجائے بعض شخصیتوں کے فکر و مزاج کا پرتو بنتے جا رہے ہیں جہاں اختلافات کو گوارا نہیں کیا جاتا، جہاں تیکھے سوالات کرنا بے ادبی اور ہنسنا ہنسانا بد ذوقی قرار پاتی ہے اور جہاں مختلف کنوؤں سے پیاس بجھانے کی روش پر قدغنیں لگادی گئی ہیں۔ ہمارے دینی مدارس بلا شبہ ہندوستان میں اسلام کے قلعے ہیں۔ لیکن کیا واقعی ان قلعوں میں مجاہد تیار کیے جا رہے ہیں؟ صورتحال یہ ہے کہ تقویٰ پر خاص زور ہے جو بجا ہے لیکن تقویٰ کی تعریف بدل دی گئی ہے۔ یہ تقویٰ خشیت الٰہی اور معاملات میں صفائی کا آئینہ ہونے کے بجائے اب اس خاص کیفیت سے عبارت ہے جس سے طلبہ اپنے اساتذہ کے سامنے لحاظ و ادب کے نام پر یتیم و مسکین نظر آئیں اور ان کی مجالس میں مہر بہ لب رہ کر اپنی تمیز و فرمانبرداری کا ثبوت دیں۔ بات تلخ ضرور ہے مگر کیا کیا جائے سچ تو کڑواہی ہوتا ہے۔

بقیہ: ندوہ کی اسٹرائک اور مولانا علی میاں

کے بارے میں کوئی ایسی بات الزام تراشی پر محمول کی جاتی ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ علاج پر

لندن میں عمران کا استقبال ایسے ہوا جیسے وہ پاکستان کے وزیر اعظم بن چکے ہوں

تحریک انصاف کی آندھی کو پاکستان میں اب کوئی نہیں روک سکتا — عمران

برطانیہ میں ۵ لاکھ سے زائد پاکستانی آباد ہیں اور ان میں سے کروڑ پتی تو چند ہی ہیں لیکن اکثریت پھر بھی کافی خوش حال ہے۔ یہاں کے پاکستانی بالعموم اپنے وطن کے بارے میں فکر مند رہتے اور وہاں کے حالات و معاملات میں دلچسپی لیتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ یہ اپنے رشتہ داروں پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ زر تعاون دیکر سیاسی پارٹیوں کو بھی اپنا ہمنوا بنالیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی ہر قابل ذکر پارٹی یہاں سرگرم ہے۔ مرحوم جنرل ضیاء الحق کے خلاف بے نظیر نے اپنی مہم یہیں سے شروع کی تھی اور انہیں یہاں کے پاکستانیوں کی ایک قابل لحاظ تعداد کی حمایت بھی حاصل تھی۔

برطانیہ کے پاکستانیوں کی پاکستان کے اندرونی معاملات میں اہمیت کا نتیجہ ہے کہ عمران خاں بھی اس حلقے کو نظر انداز نہ کرسکے چنانچہ حال ہی میں انہوں نے اپنی تحریک انصاف کا ایک جلسہ لندن میں کیا جہاں انہوں نے اس کے مقاصد اور پروگرام پر روشنی ڈالی۔

یہ جلسہ انقلابی اجتماعات کے لیے مشہور لندن کے کونوے ہال میں ہوا جہاں پانچ سو سے زائد پاکستانیوں سے پورا ہال بھرا ہوا تھا۔ یہاں عمران کا استقبال ایسے ہوا جیسے وہ پہلے ہی پاکستان کے وزیر اعظم ہوچکے ہوں۔ اس اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے عمران نے وہی کچھ کہا جو وہ پاکستان میں کئی بار کہہ چکے ہیں۔ چند ایک باتوں کو چھوڑ کر پوری تقریر میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ لیکن اپنے اسپتال میں بم دھماکے اور تحریک انصاف کے آغاز کے بعد یہ لندن میں ان کا پہلا اجتماع تھا۔ اجتماع گاہ میں سیکورٹی کا بندوبست کافی تھا اگرچہ عمران نے جراتمندانہ اعلان کیا کہ "اللہ نے ایک چیز تو مجھے دی ہے وہ بے خوفی ہے" اجتماع گاہ میں موجود نوجوان طبقے کو امید تھی کہ عمران کی شریک حیات حائقہ خان بھی آئیں گی لیکن انہیں مایوسی ہوئی۔ حائقہ اس وقت حاملہ ہیں اور ان کی طبیعت ناساز چل رہی ہے۔

اجتماع گاہ میں موجود حاضرین پر ایک نگاہ ڈالنے سے یہ اندازہ ہوا کہ برطانیہ میں موجود ممتاز پاکستانی جو پہلے بانو بے نظیر کے ساتھ تھے یا نواز شریف کے، ان میں سے اکثر اب عمران کے ساتھ آگئے ہیں۔ ان ممتاز پاکستانیوں میں سے ایک جناب ریاض ددلے ہیں جن کی ایک مشہور ٹریول ایجنسی ہے جو خاص طور سے سستے ٹکٹ فراہم کرتی ہے۔ وہ اجتماع کا انتظام کرنے میں کافی آگے آگے تھے۔

> نوجوان طبقے کو امید تھی کہ عمران کی شریک حیات حائقہ خان بھی آئیں گی لیکن انہیں مایوسی ہوئی۔ حائقہ اس وقت حاملہ ہیں اور ان کی طبیعت ناساز چل رہی ہے۔ اجتماع گاہ میں موجود حاضرین پر ایک نگاہ ڈالنے سے یہ اندازہ ہوا کہ برطانیہ میں موجود ممتاز پاکستانی جو پہلے بانو بے نظیر کے ساتھ تھے یا نواز شریف کے، ان میں سے اکثر اب عمران کے ساتھ آگئے ہیں۔

اس اجتماع یا ریلی کا اہتمام روزنامہ جنگ نے کیا تھا جو برطانیہ سے بھی چھپتا ہے۔ ریلی سے عمران نے چلتی پھرتی اردو میں خطاب کیا۔ ان کی اردو ایسی ہی تھی جس پر بس پاسنگ مارکس مل سکتے ہیں۔ اگر عمران کو اپنی تحریک کو کامیاب بنانا ہے تو انہیں اپنی اردو مزید بہتر بنانے کے ساتھ اپنی تقریری صلاحیت کو بھی جلا دینی ہوگی۔ بہرحال اپنے سامعین سے انہوں نے اپنی تحریک انصاف میں شامل ہونے کی درخواست کی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ "پاکستان میں ایک لہر ہے جسے اب کوئی روک نہیں سکتا۔"

"اس کے بعد انہوں نے اپنے ۱۰ نکاتی پروگرام کی تشریح کی جس میں اہم نکات، صاف ستھری حکومت، پولیس اور عدالتی نظام کی اصلاح، سیاستدانوں کو اپنے اثاثوں کا اعلان کرنے پر مجبور کرنا، غیر مرکزیت اور نجی کاری وغیرہ سے متعلق ہیں۔

عمران کی تقریر کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان سے پوچھا گیا کہ کیا ان کی کابینہ میں عورتیں بھی ہوں گی؟ عمران نے جواب دیا کہ پاکستان میں ہر کسی کو یکساں حقوق حاصل ہوں گے۔ لیکن انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ کوٹہ سسٹم میں یقین نہیں کرتے۔ یہ دراصل ایک طنز تھا ہندوستانی نظام پر۔ ہندوستان کے پس منظر میں عمران نے کئی باتیں کہیں جنہیں کم از کم غیر دوستانہ نہیں کہہ سکتے۔ انہوں نے ہندوستانی الیکشن کمیشن کی تعریف کی اور کہا کہ ہمارے یہاں ایسے ہی کمشنروں کی ضرورت ہے۔ پاکستانی سیاستدانوں کے پر تعیش انداز زندگی پر تنقید کرتے ہوئے عمران نے کہا کہ انہیں گاندھی سے سبق لینا چاہیے۔ غالبا عمران کے ذہن میں گاندھی کی فقیرانہ تصویر تھی۔ انہیں شاید گاندھی جی کے برلا سے تعلقات اور ان کے وہاں اکثر قیام کرنے کا علم نہیں ہے۔ عمران کو شاید یہ بھی نہیں معلوم کہ اپنے لندن کے ایک سفر کے دوران گاندھی جی کلیرج جیسے مہنگے ہوٹل میں ٹھہرے تھے اور ہاتھ دھونے کے لیے صابن کے بجائے مٹی کا استعمال کیا تھا جس سے بیسن کے پانی بہنے کا راستہ بند ہو کر رہ گیا تھا۔

مراسلات

کیا اس طرح کشمیر کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے؟

کشمیر میں انتخابات میں حصہ لینے والوں کے متعلق کوئی رائے زنی نہ کرنے یا قیاس آرائی سے بچنے سے کیا یہ حقیقت ٹل سکتی ہے کہ بھارت کے آئین اور قانون کے تحت جو بھی امیدوار زیادہ ووٹ حاصل کرے گا اس کو کامیاب قرار دیا جائے گا۔ یہ اور بات ہے کہ ووٹ ڈالنے والے کون تھے اور کہاں سے آئے تھے؟ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس طرح سے مسئلہ حل ہوجائے گا۔ کیا شورش مکمل طور پر ختم ہوگی۔ جو ایسا سمجھتا ہے وہ بیوقوفوں کی دنیا میں رہتا ہے۔ کشمیر میں اب تک کم و بیش درجن بھر انتخابات ہوچکے ہیں۔ ۵۱ء سے ۸۹ء تک کتنے لوگ بلامقابلہ پارلیمنٹ اور اسمبلی میں آئے۔ پھر کیا مسئلہ کشمیر کی حیثیت اور حقیقت اس سے تبدیل ہوئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان ہی بھونڈے انتخابات نے کشمیری عوام کو ہندوستان سے دور کردیا۔ کیونکہ کبھی حقیقی نمائندوں کو سامنے آنے ہی نہیں دیا گیا جس سے لوگوں کے دلوں میں نفرت کے بیج پیدا ہوگئے۔ حالانکہ یہ ایک الگ حقیقت ہے کہ انتخابات محض انتظامی امور کی انجام آوری کے لیے ہوتے تھے۔ اس ضمن میں صرف ایک مثال کافی ہوگی۔ ۱۹۸۷ء کے انتخابات میں جب دلی والوں کو یقین ہوگیا کہ اب کی بار ان کی چالیس سالہ دھاندلی دنیا کے سامنے آئے گی تو راجیو جی نے نتائج کو تلپٹ کرنے کا سگنل دے دیا۔ یقین نہ ہو تو سرینگر کے دل امیراکدل کے نتائج کی کھوج کرلو اور وہیں سے برف پٹرول میں تبدیل ہوگئی۔ چار ہزار ووٹ والا کامیاب اور ۳۲ ہزار والا سیدھے ہیرانگر جیل میں

قابل غور ہے کہ موجودہ الیکشن میں کرایے کے امیدواروں نے ووٹر لسٹ میں کبھی اپنا نام بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ جموں کے دو تین امیدواروں کو چھوڑ کر باقی کا کشمیر کے سیاسی منظر نامے پر کبھی کوئی نام نشان نہیں ملے گا۔ البتہ کانگریس کے چند لوگوں کو تو ہر حال میں سولی پر چڑھنا ہی ہے۔ آخر اب تک مسلسل دلی والوں کو بلیک میل جو کیا ہے۔ بی جے پی کا جموں تک تو محدود اثر ہے۔ لیکن کشمیر اور لداخ میں تو ان کا کوئی نام لیوا بھی نہیں ہے۔ پینتھرس پارٹی کے صدر نے پردے کے پیچھے رہنے والے لوگوں کے اشاروں پر جرائم پیشہ لوگوں کی پیٹھ ٹھونک دی ہے۔ ہاں نیشنل کانفرنس نے دیر آید درست آید کے مصداق اپنے بچے کھچے ورکروں کی جان بچانے کا عارضی طریقہ نکال لیا۔

کیا اس طریقے سے کشمیر کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ کیا بھارت کو کچھ راحت ملے گی؟ یہ صرف دیوانے کا خواب ہے۔ سراب ہے اس سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔ ہاں کچھ نئے لوگوں کو کشمیر کے عوام کا استحصال اور دلی والوں کو بلیک میل کرنے کا بہانہ مل جائے گا۔

ابوالمبشر۔ بڈگام، کشمیر

"نہ الیکشن سے نہ سلیکشن سے۔ یہ مسئلہ حل ہوگا دل موہ لینے سے"

ہندوستان میں کچھ لوگ برابر یہ رٹ لگائے ہوئے ہیں کہ کشمیر کا مسئلہ الیکشن سے حل ہوجائے گا۔ کون ان نادانوں، نافہموں کو سمجھائے کہ الیکشن ہی اس مسئلہ کا حل ہوتا تو فاروق عبداللہ سے حکومت سلب کیوں کی جاتی بہرحال ہم بھی منتظر رہیں گے ان کی ان شعبدہ بازی کے لیکن میں ہندوستان کے تمام علماء و فضلا دانشور و صحافی سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا وہ اس بات سے متفق ہیں کہ کیا وہ قوم انتخابات سے اپنے آنسوؤں کو خشک کرسکتی ہے جس کے گھر میں ۲۲ افراد زندہ تھے مگر اب صرف چار آدمیوں کے سوا کوئی نظر نہیں آرہا ہے۔ کیا ان کا دماغ اس بات کو قبول کررہا ہے کہ الیکشن ہی سے کشمیر کا مسئلہ حل ہوگا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں بھی کشمیر کا ایک فرد ہوں اور میں وہاں کے حالات سے واقف ہوں کہ اس الیکشن کے پیچھے کیا مقاصد کار فرما ہیں۔ اس سے صرف گورنر کرشنا راؤ اپنی لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگ کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں مگر ان کو کون سمجھائے کہ آج تک کوئی بھی مسئلہ زبردستی ظلم و ستم استبداد و اجارہ داری سے حاصل نہیں ہوا۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ کشمیری مسلمان اس گن کلچر سے متنفر ہوچکا ہے۔ جو بندوق اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام نافذ کرنے کے لیے اٹھائی گئی تھی لیکن اس اسلامی تحریک میں کچھ ایسے بندوق بردار بھی داخل ہوئے جو کبھی سینماہالوں کے بلیکر، شراب خانوں کے ساقی افیون و چرس کے دلدادہ تھے جس کی وجہ سے لوگ کھرے اور کھوٹے کو وقت پر نہ پہچان سکے چنانچہ ان غلط کار بندوق برداروں نے اپنے مسلم بھائیوں کو بھی نہیں بخشا جہاں موقع ملا لوٹ مار بھی کی عصمت دری بھی کی لیکن آخر ظالم سفاک بدمعاش لٹیرے اپنی بات کو کب تک مخفی رکھ سکتے ہیں یہ بات چھپائے چھپ نہیں سکتی آخر کار ان لوگوں کے چہروں کے پردے اس وقت آشکارہ ہوئے جب وہ اپنے اصلی مطمح نظر کو فراموش کرکے اپنے ماضی کی طرف لوٹ گئے اور باضابطہ طور پر سرنڈر کرکے گورنر کی چھتر چھایہ میں پناہ لی اور ان بلیکروں نے اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے خلاف اعلان جنگ کیا جس کا فائدہ گورنر نے اٹھانے کی کوشش کی اور یہ رٹ لگائی کہ حالات قابو میں آگئے لیکن کیا واقعی اس ٹولی سے بھارت فائدہ اٹھاسکتا ہے اگر ایسی بات ہوتی تو کشمیری عوام عمر فاروق، سید علی گیلانی، فاروق عبداللہ، غلام رسول کار وغیرہ کو اپنا لیڈر منتخب کرکے مسئلہ ختم کردیتے لہٰذا یہ وہ آگ ہے جو الیکشن سے اب بجھ نہیں سکتی۔

اس مسئلہ کو جب تک پاکستان و انڈیا فٹبال کا کھیل بنائے رہیں گے تب تک اس کا حل نہیں نکل سکتا۔ لہٰذا اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے گورنر کو اپنی ضد پر قائم رہنے کے بجائے کشمیری عوام کے دلوں کو موہ لینا چاہیے تب ہی اچھے مستقبل کی امید کی جاسکتی ہے۔ بھارت کے ذی شعور خاص کر مسلم پرسنل لابورڈ کے زعماء کو میدان میں آکر اس مسئلہ کے حل کو تلاش کرنا چاہیے۔

ثاقب حمید لولابی، کشمیر

نیپال میں اپنی نوعیت کا پہلا مذہبی پروگرام

دنیا کے واحد ہندو ملک نیپال میں مسلمانوں کی معتد بہ تعداد پائی جاتی ہے مگر بہت سے علاقوں میں شرک و بدعت کی گہری تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ لادینی اور مذہب بیزاری عام بات ہے۔ لیکن نیپال کے قصبہ کرشنا نگر عرف جھنڈا نگر میں "مرکز التوحید" نے توحید و رسالت کی خالص کرنوں سے اندھیروں کو روشنی بخشی ہے اور دین خالص کے دھندلے نقوش کو اجاگر کیا ہے۔ مرکز التوحید کی جانب سے ۱۲ سے ۲۴ اپریل کے درمیان دورہ تدریبیہ، جشن تقسیم اسناد اور اجلاس عام کا انعقاد کیا گیا۔ واضح ہو کہ مرکز التوحید کی جانب سے مولانا عبداللہ مدنی کے زیر نگرانی "مدرسۃ البنات، خدیجۃ الکبریٰ، بچوں کا مدرسہ، اقرا ماڈل اسکول، اور ماہنامہ، نور توحید" اپنی کرنیں بکھیر رہے ہیں۔

دورہ تدریبیہ میں نیپال کے متعدد مدارس کے صدر اور ذمہ دار علماء نے شرکت کی۔ بعض حضرات نے آٹھ نو سو کلومیٹر کا سفر طے کرکے اس ریفریشر کورس میں حصہ لیا۔ مسلم کمیونٹی ہال میں انہیں ٹھہرایا گیا۔ اس کورس میں درس اور لکچر کے لیے ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری جامعہ سلفیہ بنارس، ڈاکٹر فضل الرحمن جامعہ محمدیہ منصورہ مالیگاؤں، مولانا عبدالسلام رحمانی، مولانا رضاء اللہ بدایونی، ڈاکٹر رضاء اللہ مبارکپوری اور مولانا عبدالواحد مدنی وغیرہ کا انتخاب کیا گیا۔ ۱۹۹۴ تا ۱۹۹۵ کے تعلیمی سیشن میں مدرسہ خدیجۃ الکبریٰ کی فارغات کو سندیں تقسیم کی گئیں۔ مذکورہ شخصیات نے اس تقریب میں بھی شرکت فرمائی۔ اس پروگرام کے مہمان خصوصی مولانا عبدالوہاب خلجی ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیۃ اہل حدیث تھے۔ فارغات کو سنت طریقے سے اسناد تقسیم کی گئیں۔ یہ اسناد مختلف شخصیات کے ہاتھوں سے ہوتی ہوئی مولانا خلجی کے ہاتھ میں پہنچیں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی اہلیہ میمونہ ثروت صاحبہ کو دیں اور پھر ان کے بدست فارغات تک پہنچائی گئیں۔ انہوں نے فارغات کو ردائے فضیلت بھی پیش کی۔ اس موقع پر علماء کرام اور مہمانوں نے خطاب بھی کیا جو اتنا اثر آفریں تھا کہ اکثر خواتین کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ ۲۴ اپریل کی شب میں اجلاس عام ہوا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری نے کی۔ اس میں علماء کرام کے خطاب کے بعد شرکاء دورہ تدریبیہ کو ڈاکٹر ازہری کے دست مبارک سے اسناد دی گئیں۔ یہ پروگرام فی الواقع نیپال کی سرزمین پر اپنے طرز کا منفرد پروگرام تھا اور نیپال میں پہلی مرتبہ خواتین فارغات کو سند فراغت اور ردائے فضیلت سے نوازا گیا۔

حماد انجم ایڈوکیٹ۔
بوہرسن بازار، سدھارتھ نگر۔ یوپی

کیا ملائم سنگھ مسلمانوں کے رہنما ہیں؟

یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہمارے مسلم معاشرے کے دانشوروں اور مفکروں کے لیے موضوع بحث بنا ہوا ہے کہ کیا ملائم سنگھ مسلمانوں کے لیے سنجیدہ ہیں۔ اس کا جواب دیکھنے کے لیے اگر ہم ان کو شروع سے دیکھیں تو ان سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ رہی نوکری والی بات تو اس میں ڈاکٹر مسعود احمد کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے جس نے معاشی حالت سے دوچار مسلم معاشرے کو معاشی وزن دینے کی کوشش کی۔ ہاں ملائم سنگھ نے اتنا ضرور کیا کہ مسلمانوں کو ملانے کے لیے ہندوؤں کو برا کہا ان کے جذبات کو بھڑکایا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سارا ہندو ہندوتو کی لہر میں بہہ گیا زیادہ تفصیل تو میں نہیں دے سکتا لیکن مثال کے طور پر مہاراشٹر کا حال زیر غور ہے۔ وہاں پر ملائم سنگھ نے مسلمانوں کو اپنی طرف کرنے کے لیے غیر ذمہ دارانہ رویہ اپنایا۔ پارلیمانی انتخابات میں مہاراشٹر سے کانگریس کا صفایا ہوگیا ملائم کی وجہ سے مسلمان بٹا اور سارا فائدہ بی جے پی کو پہنچا۔ ملی ٹائمز انٹر نیشنل کی مدد سے قوم کے ایک ناچیز فرد ہونے کی حیثیت سے مسلمان بھائیوں سے میری مخلصانہ گذارش ہے کہ وہ اپنے عقل سلیم سے کوئی فیصلہ لیا کریں کوئی ہمارا قائد نہیں سب اپنے اپنے فائدے میں لگے رہتے ہیں۔

محمد حسین انصاری، مچھلی شہر

مدھیہ پردیش کے اولڈ بوائز کی اپیل

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن مدھیہ پردیش (بھوپال) کی ورکنگ کمیٹی کو اس اطلاع سے انتہائی تشویش ہوئی ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹاف ایسوسی ایشن نے موسم گرما کی سالانہ تعطیل کو امسال رد کردیا ہے۔ اطلاع میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ "اس سے قبل وائس چانسلر نے اساتذہ سے یہ اپیل کی تھی کہ سال رواں میں یونیورسٹی کے طویل مدت تک بند رہنے سے طلباء کو پڑھائی کا شدید نقصان ہوا ہے اس کو دیکھتے ہوئے طلبا کو مزید پڑھائی کی خاطر اساتذہ امسال سالانہ گرما کی تعطیل سے دست بردار ہوجائیں۔" ہمارے حقیر نظریہ کے مطابق اے۔ ایم۔ یو اسٹاف ایسوسی ایشن مادر درسگاہ کی اعلیٰ روایات کے مدنظر اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرے۔ اور ایک خوش گوار اور ہم آہنگی کے ماحول کو قائم کرنے کے لیے اپنی تمام تر توجہ اور کاوش کو بروئے کار لائے تاکہ جامعہ کے طلباء کے مفاد کے اولین فریضہ کی تکمیل ہوسکے۔

ہم اراکین مجلس عاملہ اے۔ ایم۔ یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن مدھیہ پردیش (بھوپال) آپ سے پر زور مخلصانہ اپیل کرتے ہیں کہ باہمی گفت و شنید سے یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد اساتذہ کرام اور طلباء کے درمیان مفاہمت اور اعتماد کی فضا قائم کرنے میں فوری اقدام پر غور فرمائیں۔ ہماری تمام تر نیک خواہشات ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گی۔

اراکین مجلس عاملہ (ورکنگ کمیٹی)
اے۔ ایم۔ یو۔ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن مدھیہ پردیش

باجپئی کی تقریر جھوٹ کا پلندہ

ہمارے آر ایس ایس کے نامزد وزیر اعظم نے ۱۹ مئی کو ۸ بجے دور درشن اور ریڈیو پر ملک کو خطاب کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ "یہ ملک کبھی مذہبی ملک نہیں بن سکتا۔" جو لوگ آر ایس ایس کی ذہنیت سے واقف ہیں کیا اس بات پر اعتبار کرلیں گے؟ باجپئی کا پورا لکچر ملک کو گمراہ کرنے کے لیے رہا ہے۔ انہوں نے جھوٹ کہا کہ اجودھیا کا واقعہ ۶ دسمبر بی جے پی یا آر ایس ایس کا طے شدہ پروگرام نہیں رہا۔ سوال یہ ہے کہ جب پہلے سے طے شدہ نہیں تھا تو ان کے لوگ بارود لیکر کیسے گئے تھے؟ کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ "اب تو کھلم کھلا ہے، نرسمہا راؤ ملا ہے" وزیر اعظم کا جھوٹ بولنا زیب نہیں دیتا۔ آر ایس ایس اور بی جے پی ایک نکاتی ہندوتو کی بھاؤنا بھڑکا کر اقتدار پر قبضہ کرنا اور مسلم دشمنی قائم کرکے فاشزم کو فروغ دینا چاہتی ہے۔ ان کی حکمت عملی ہمیشہ اس ملک کو ہندو راشٹر بنانے کی رہی ہے اور ہے مزید یہ کہ جھوٹ کا سہارا بھی لے کر اپنی حکمت عملی کو بروئے کار لانا یہ طبقہ ہمیشہ اپناتا رہا ہے۔ آج ایک جھاڑو سے اس سوچ پر کالکھ پوتنا بالکل مکاری اور عیاری ہے۔

ایک جھوٹی بات شری باجپئی نے یہ بھی کہی "کیرل میں پہلی مسجد ہندو راجہ کی عنایت سے بنی تھی اور ہندوستان میں عیسیٰ کے سولی کے چڑھنے کے بعد پہلا چرچ بنا تھا" انہیں کیا پتہ کہ کسی کی عنایت سے مسجدیں اور چرچ نہیں بنا کرتے جہاں بھی مسلمان یا عیسائی رہنے لگیں گے وہ اپنے پیسے سے زمین خرید کر مسجدیں اور چرچ اپنی عبادت کے لیے بنا ہی لیں گے کیوں کہ زمین سب اللہ کی ہے "اور وہی سب سے بڑا وارث ہے" "القرآن"۔

انہوں نے ہندوستان میں سیکولر جمہوریت کی وکالت کی مگر آر ایس ایس کے نزدیک سیکولر کا مطلب وہی ہوگا جو ۶ دسمبر کو اجودھیا میں ہوا کیوں کہ وہ (آر ایس ایس) سیکولر کی تشریح اپنے طور پر کرتے ہیں جس کا علم دنیا والوں کو پہلے سے ہے۔

کمال الدین
تیتری بازار، سدھارتھ نگر۔ یوپی

ایک ممبر اسمبلی کی ظالمانہ کارروائیاں

نوادہ ضلع کے ہنسوا حلقہ انتخاب کے کانگریسی ایم۔ ایل۔ اے آدت نارائن سنگھ نے عوام کے ساتھ جو ناانصافی کی ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان سے عوام کی جتنی امیدیں وابستہ تھیں اس کا خون ہوگیا ہے۔ انہوں نے سبز باغ دکھا کر الیکشن جیت لیا اور وعدہ کو آج تک عملی جامہ نہیں پہنایا۔

گذشتہ کئی برسوں سے قتل و غارت گری، عصمت دری اور جبراً زمین و جائیداد پر قبضہ ان کا مرغوب مشغلہ بن گیا ہے۔ کتنی معصوم اور بے سہارا عورتیں ان کی ہوس کا شکار ہوچکی ہیں۔ کتنے بے گناہ اور مظلوموں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔ پسماندہ طبقوں کے ساتھ انصاف آج بھی نہیں ہورہا ہے۔ اضح ہو کہ آدت سنگھ منڈل کمیشن کی رپورٹ نافذ ہونے کے بعد سے سرخیوں میں رہے ہیں۔ گذشتہ ۱۵ برسوں سے وہ ہنسوا اسمبلی حلقے کی نمائندگی کرتے چلے آرہے ہیں۔ پہلی دفعہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑ کر وہ کانگریس پارٹی میں شامل ہوگئے۔ اس کے بعد سے وہ اب تک مستقل کانگریس کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ اس طرح وہ چار بار سے مسلسل ممبر اسمبلی ہیں۔

پچھلے دس برسوں سے یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ نرہٹ بلاک کے چند ہی ایسے خوش نصیب افسر ہوں گے جن کا بغیر آدت سنگھ سے مار کھائے یہاں سے تبادلہ ہوا ہو۔ اور نرہٹ تھانہ ان کی دھونس کا شکار تو شروع سے ہی رہا ہے۔ لیکن کوئی ایسا نہیں ہے جو ان کے مظالم پر بند باندھ سکے۔ لوگوں کی توقعات، ۲۰ سالہ نوجوان اور جنتادل کے سیاستداں سید مسیح الدین سے وابستہ ہیں۔ یہ نوجوان ماضی میں کانگریس کا ایک سرگرم رکن تھا۔ لیکن اب جنتا دل میں ہے۔ کیا مسیح الدین مظلوموں کی توقعات پوری کریں گے؟

شاہ نواز اختر۔ بہار

باپ جیل میں تھا اور وہ فتوحات کی نئی تاریخ لکھ رہی تھی

ٹینس کی ملکہ اسٹیفی گراف کی اول العزمی نے اسے کامیابیوں کے ہمالہ پر بیٹھا دیا

وہ ٹینس جیسے دولتمندوں کے کھیل کی ملکہ ہے۔ چند ہفتے قبل اس نے ایک دوسری عظیم کھلاڑی مرٹینا نوراتی لووا کو ایک اور شکست دی جب وہ دنیا کی سب سے زیادہ عرصے تک رہنے والی نمبر ایک کھلاڑی بن گئی۔ اس نے ۱۳ مئی کو نمبر ایک کھلاڑی کی حیثیت سے ۳۳۲ ہفتے پورے کرلیے۔ اس بلندی پر اکثر وہ تنہا رہی ہے۔ صرف چند ہفتے ایسے ہیں جب اسے یہ اعزاز مونیکا سیلس کے ساتھ تقسیم کرنا پڑا ہے۔ یہ ٹینس کھلاڑی کوئی اور نہیں بلکہ جرمنی کی اسٹیفی گراف ہے۔ گراف نے نہ صرف مرٹینا اور کرس ایورٹ جیسی کھلاڑیوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے بلکہ وہ مردوں سے بھی آگے نکل گئی ہے۔ مردوں میں سب سے زیادہ دن نمبر ایک رہنے کا اعزاز ایوان لینڈل کو حاصل ہے یعنی ۲۷۰ ہفتے۔ گراف کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ لگاتار ۱۸۶ ہفتے نمبر ایک کھلاڑی رہی ہے جو ایک ریکارڈ ہے۔

جب گراف کو یہ بتایا گیا کہ وہ اس وقت کن بلندیوں پر فائز ہے تو وہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔ اس نے یہ ضرور سوچا ہوگا کہ ایک سال قبل اس کا کیریر تقریباً ختم ہونے والا تھا۔ اس کے کھیل کی خرابی یا زوال کی وجہ سے نہیں بلکہ ٹینس کورٹ سے باہر مسائل اور چوٹوں کی وجہ سے۔ لیکن ایک عظیم کھلاڑی کی طرح اس نے نہ صرف ان مسائل کا جم کر مقابلہ کیا بلکہ اپنے مخالف کھلاڑیوں کو یکے بعد دیگرے شکست دیتی گئی اور ٹینس کورٹ پر جو کچھ تھا وہ سب فتح کرلیا۔
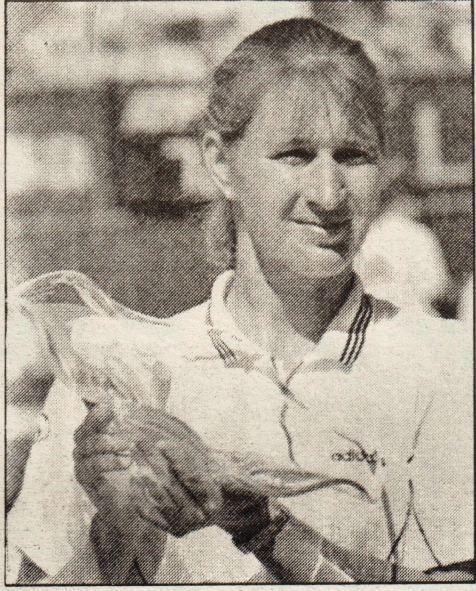
☆ اسٹیفی گراف

ٹینس کورٹ پر حاصل ہونے والی کامیابیوں نے گراف کو سکون قلب عطا کیا ہے۔ ورنہ شہرت کی بلندی پر فائز کھلاڑیوں کے لیے ہمیشہ مسائل کھڑے ہوتے رہتے ہیں۔ دو سال قبل ایک خاتون نے الزام لگایا تھا کہ اس کی اولاد کا باپ دراصل گراف کا باپ پیٹر گراف ہے۔ گراف اپنے والد کی تقریباً پوجا کرتی ہے۔ پیٹر ہی نے دراصل اسٹیفی گراف کو اتنا عظیم کھلاڑی بنایا ہے۔ وہ صرف باپ ہی نہیں بلکہ اپنی بیٹی کا کوچ، منیجر اور گائڈ بھی ہے۔ اس الزام کے بعد اسٹیفی کی توجہ کا تقسیم ہونا ضروری تھا۔ یہ وہی وقت تھا جب گراؤنڈ شاٹ کی ماہر مونیکا ٹینس کے منظر نامے پر طوفان کی طرح ابھر رہی تھی۔ گراف کی ذہنی بے اطمینانی اور عدم یکسوئی کا اس نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اسے ومبلڈن کو چھوڑ کر ہر میدان پر شکست دی۔ گراف اپنے اس بحرانی دور سے نکل ہی رہی تھی کہ مونیکا سیلس کو گراف ہی کے ایک تقریباً پاگل شیدائی نے زخمی کردیا جس کی وجہ سے اسے کھیل کے منظر سے غائب ہونا پڑا۔ چونکہ زخمی کرنے والا خود کو گراف کا شیدائی کہتا تھا اس لیے ایک دو ٹورنامنٹوں میں اس کا اس پر کافی اثر رہا اور وہ خطاب جیت نہ سکی۔ لیکن اس کے بعد اس نے جو فتوحات کے راستے پر قدم رکھا تو پھر مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا۔

سال بھر سے زائد وقفے کے بعد مونیکا سیلس گذشتہ سال امریکی اوپن میں کھیلنے اتری اور فائنل میں گراف سے مڈبھیڑ سے قبل سب کو خس و خاشاک کی طرح بہائے جارہی تھی۔ لیکن گراف نے ایک زبردست میچ میں تین سیٹوں میں یہ فائنل جیت لیا۔ گراف نے اسے اپنی زندگی کا سب سے اہم خطاب قرار دیا۔

گذشتہ سال امریکی اوپن کا خطاب گراف نے اس وقت جیتا جب اس کا مشفق باپ جیل میں تھا۔ گراف ہمیشہ کھیلتی رہی اور اپنے پیسوں وغیرہ کا حساب کتاب اپنے باپ کے حوالے کرر کھا ہے۔ پیٹر پر جرمنی کا الزام ہے کہ اس نے لاکھوں ڈالر ٹیکس کی چوری کی ہے۔ اس الزام کے تحت اسے گذشتہ سال اگست میں گرفتار کرلیا گیا۔ اس ضمن میں اسٹیفی سے بھی پوچھ گچھ کی گئی۔ اس طرح گذشتہ سال امریکی اوپن کے فائنل کے وقت گراف جذباتی اعتبار سے بکھری ہوئی تھی۔ لیکن اس نے عزم، حوصلے اور صبر سے کام لیا اور فاتح بن کر نکلی۔

اسی ماہ کے آخر میں گراف فرینچ اوپن میں شریک ہوگی جہاں ایک بار پھر مونیکا سیلس سے مقابلہ متوقع ہے۔ اس وقت گراف کورٹ کے ٹورنامنٹوں میں حصہ لے رہی ہے جہاں اسے کچھ جھٹکے بھی لگے ہیں۔ لیکن ٹینس کی یہ ملکہ اب ایسے جھٹکوں کی عادی ہوگئی ہے۔ اس نے زندگی کی صعوبتوں کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ اس کا مشفق باپ آج بھی جیل میں ہے۔ اسے گذشتہ سال اگست میں گرفتار کیا گیا تھا۔ گراف اکثر اپنے باپ کو یاد کرکے رو دیتی ہے۔ نقادوں کا کہنا ہے کہ اس حادثے نے گراف کی توجہ پر اثر ڈالا ہے جس کی وجہ سے کئی میچ ہار چکی ہے۔

گراف نے ۱۹۸۵ سے پروفیشنل ٹینس کھیلنا شروع کیا۔ اس کا پہلا بڑا ٹورنامنٹ جرمن اوپن تھا جس میں اس نے کرس ایورٹ جیسی کھلاڑی کو سیمی فائنل میں شکست دی۔ اس وقت سے گراف نمبر ایک کھلاڑی بننے کے خواب دیکھتی رہی ہے۔ بالآخر وہ نہ صرف نمبر ایک کھلاڑی ہوئی بلکہ اس بلندی پر سب سے زیادہ دنوں تک فائز رہ چکی ہے۔

ایک وقت تھا جب ایسا لگتا تھا کہ گراف کا کیریر ختم ہوجائے گا۔ خاص طور سے گذشتہ اگست میں اپنے باپ کی گرفتاری نے اسے جذباتی اعتبار سے توڑ کے رکھ دیا تھا۔ لیکن اس نے ایک سچے چمپین کی طرح اس سب کا مقابلہ کیا۔ گذشتہ سال جب اس نے امریکی اوپن کے فائنل میں مونیکا کو شکست دی تو اس کی نگاہیں تماشائیوں کے اسٹینڈ میں اپنے باپ کو تلاش کررہی تھیں جو اس وقت جیل میں ہے۔ جہاں گراف کو ان سے ملنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ گراف کی والدہ اور اس کے کوچ اسے ہر قسم کی مدد دیتے ہیں لیکن باپ کی شفقت، رہنمائی اور دلجوئی کی کمی وہ ہمیشہ محسوس کرتی ہے۔

> گراف نے نہ صرف مرٹینا اور کرس ایورٹ جیسی کھلاڑیوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے بلکہ وہ مردوں سے بھی آگے نکل گئی ہے۔ مردوں میں سب سے زیادہ دن نمبر ایک رہنے کا اعزاز ایوان لینڈل کو حاصل ہے یعنی ۲۷۰ ہفتے۔ گراف کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ لگاتار ۱۸۶ ہفتے نمبر ایک کھلاڑی رہی ہے جو ایک ریکارڈ ہے

روی شاستری یونیسیف کے قومی سفیر بن گئے ہیں

ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے سابق آل راونڈر اور کپتان اور موجودہ ٹی وی کمنٹیٹر روی شاستری کو یونیسیف کا قومی سفیر برائے اطفال مقرر کیا گیا ہے۔ یونیسیف کے سفیر بننے کے بعد شاستری اس ٹیم کے حصہ بن گئے ہیں جس میں راجر مور، پیٹر استینوف، جولیا رابرٹس اور ہیری بیلافونٹ جیسے لوگ شامل ہیں۔ ان لوگوں کا کام یہ ہے کہ وہ جہاں بھی جاتے ہیں، غریب بچوں کے کاز کو ترقی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہندوستان میں یونیسیف کا سفیر برائے اطفال ہونے کے بعد شاستری اس ملک میں بچوں کی حالت زار کو اجاگر کرکے ارباب اقتدار کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں گے۔

قومی سفیر مقرر ہونے کے بعد روی شاستری نے کہا کہ "ہندوستان کا مستقبل اس کے بچوں سے وابستہ ہے تاہم بہت سے بچوں کے حقوق پورے نہیں کیے جاتے۔ ہر نو میں ایک بچہ پانچ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی مرجاتا ہے۔ ہندوستان کے نوخیز بچوں میں سے نصف سے زائد کو پوری غذا نہیں ملتی اور دس کروڑ سے زائد بچے اسکول نہیں جاتے۔" شاستری نے مزید کہا کہ "۲۱ ویں صدی میں ہم داخل ہونے کے قریب ہیں۔ یہ وقت ہے جب ہمیں بچوں کو قومی ایجنڈے میں سب سے اوپر جگہ دینی ہوگی۔"

ہندوستان میں یونیسیف کے نمائندے ڈاکٹر جون روڈ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس ملک میں ان کی تنظیم ۱۹۴۹ء سے کام کررہی ہے۔ بنیادی طور پر یہ تنظیم صحت اور پانی کی صفائی وغیرہ کے میدانوں میں سرگرم ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "روی شاستری ہماری ایک ایسے سماج کی تشکیل میں مدد دے سکتے ہیں جو یہ قبول نہیں کرتی کہ اس کے کچھ بچے اسکول نہیں جاسکتے یا کچھ بچے کم عمری میں بعض ایسی بیماریوں سے مرجاتے ہیں جن کا آسانی سے علاج کیا جاسکتا ہے۔"

> ہندوستان کا مستقبل اس کے بچوں سے وابستہ ہے تاہم بہت سے بچوں کے حقوق پورے نہیں کیے جاتے۔ ہر نو میں ایک بچہ پانچ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی مرجاتا ہے۔

بقیہ: ازدواجی زندگی کی نعمتوں پر سماجی لعنتوں کا غلاف

نقش قدم پر چلتے ہیں جس کی کئی مثالیں ہمیں اپنے گرد و پیش میں مل جائیں گی۔

انسانی معاشرت کا یہی وہ اذیت ناک پہلو ہے جس کے اسباب کا احساس و ادراک آج سے صدیوں پہلے نبی آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوچکا تھا اور آپ نے شراب کو ام الخبائث کا نام دیا تھا کیونکہ یہ وہ شے ہے جو انسان کی آنکھ پر ایسا پردہ ڈال دیتی ہے کہ وہ انسانی رشتوں کے احترام کا احساس بھی کھو بیٹھتا ہے۔ کیا اس کی تصدیق ہمارے ہی اخبارات میں شائع ہوئے باپ کے ہاتھوں بیٹی کی ناموس لٹنے کے ان شرمناک واقعات سے نہیں ہوتی جن کی تفصیل میں جانے سے قلم رکتا ہے۔ اور اسی ملک کے کئی شہروں میں ہر شام شراب کی دوکانوں کے سامنے شائقین کی لمبی قطاریں دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ وہ گیہوں اور چاول کی راشن شاپ پر کھڑے ہوں۔ اس صلائے عام سے رشتوں کی پامالی کے دروازے چوپٹ کھولنے کا ذمہ دار کون ہے؟ اس ملک کی حکومت یا اس کے عوام؟

بقیہ: فقہی سوال و جواب

بناتا ہے کہ باقاعدہ وضو کیے بغیر قرآن کریم کو چھوا نہیں جاسکتا۔ دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ اگر مقصد یاد کرنا اور بچوں کو پڑھانا ہو تو وضو کرنا ضروری نہیں ہے۔ قرآن کریم کو باوضو چھونے کی صراحت کے پیش نظر بعض حضرات کو ہم نے ایک اور طریقے پر عمل کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ یہ کہ جب وہ باوضو نہ ہوں اور انہیں کوئی آیت دیکھنی مقصود ہوتی ہے تو کسی باوضو شخص سے قرآن کریم کو مطلوبہ جگہ سے کھلوا لیتے ہیں اور پڑھ لیتے ہیں اس طرح کہ خود اپنے ہاتھ سے قرآن کریم کو نہیں چھوتے۔

ایسے افراد جو اس طرح کے عوارض میں مبتلا ہوں کہ وضو باقی نہیں رہ پاتا انہیں تجدید وضو کے بغیر تلاوت قرآن کریم کی اجازت ہے۔ ایک عام صحت مند انسان کے مقابلے معذور شخص کا شریعت میں خاص خیال رکھا گیا ہے۔ ایک تو وہ شخص ہے جسے وضو کرنے میں کوئی قباحت نہیں اور تادیر اسے باقی رکھ سکتا ہے اور دوسرا وہ شخص ہے جسے بارہا وضو کرنے میں دشواری اور بیماری کا اندیشہ ہے تو ایسی حالت میں اسے چھوٹ حاصل ہے۔

اندرونی جسمانی کمزوری بالوں کو وقت سے پہلے کمزور اور سفید بنا دیتا ہے

باشعور خواتین اچھی طرح جانتی ہیں کہ بالوں کا زیب و زینت سے گہرا تعلق ہے

خواتین کو اپنی جاذبیت برقرار رکھنے کے لیے جن ظاہری عوامل کی طرف خصوصی توجہ دینی ہوتی ہے ان میں بالوں کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ عام صحت اور جسم کی نشوونما کے انداز کا بالوں کی صحت پر بھی اثر پڑتا ہے۔ بال گرنے کی شکایت اکثر عورتوں اور بچیوں کو رہتی ہے۔ کسی کے بال بہت باریک اور روکھے ہوتے ہیں، رنگ ماند پڑتا ہے اور چمک نام کو نہیں پائی جاتی۔ کہا جاتا ہے کہ بالوں میں تیل لگانے سے ان کی جڑوں کو غذا ملتی ہے جس سے وہ مضبوط ہوتے ہیں لیکن بعض خواتین کا تجربہ بتاتا ہے کہ جب وہ بالوں میں تیل ڈال کر مالش کرتی ہیں تو بہت سارے بال ٹوٹتے ہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جن سے خواتین کا سروکار ایک فطری امر ہے۔

جہاں تک نوعمری میں لڑکیوں کے بال گرنے کا سوال ہے تو طبی نقطہ نظر سے ایسا اس وقت تک نہیں ہونا چاہیے جب تک کہ جسم کسی اندرونی کمزوری کا شکار نہ ہو۔ اس کمزوری کا سبب معلوم کرنے کے لیے پیشاب، خون اور اجابت کی جانچ کرانی چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ صحت مند اور متوازن خوراک کا اہتمام کیا جائے جس میں تازے پھل اور سبزیاں زیادہ ہوں۔ ساتھ ہی کسی ہیلتھ ٹانک کا استعمال بھی برابر کیا جائے۔ ناریل کا تیل گرم کرکے ہفتہ میں ایک بار مالش کریں اور مالش کے بعد سر پر گرم تولیہ لپیٹ لیں۔ سر کی جلد کو تقویت دینے والا کوئی ٹانک بھی استعمال کرنا شروع کریں۔ اس اعتبار سے انڈا بہتر رہے گا۔ اس کے علاوہ دال اور ابلی ہوئی سبزی کے پانی سے سر دھونے سے بھی سر کی کھال کو بہت اچھا تقویہ فراہم ہوتا ہے۔

> کہا جاتا ہے کہ بالوں میں تیل لگانے سے ان کی جڑوں کو غذا ملتی ہے جس سے وہ مضبوط ہوتے ہیں لیکن بعض خواتین کا تجربہ بتاتا ہے کہ جب وہ بالوں میں تیل ڈال کر مالش کرتی ہیں تو بہت سارے بال ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جن سے خواتین کا سروکار ایک فطری امر ہے۔ ناریل تیل گرم کرکے ہفتہ میں ایک بار مالش کریں اور مالش کے بعد سر پر گرم تولیہ لپیٹ لیں۔ سر کی جلد کو تقویت دینے والا کوئی ٹانک بھی استعمال کرنا شروع کریں۔ اس اعتبار سے انڈا بہتر رہے گا۔ اس کے علاوہ دال اور ابلی ہوئی سبزی کے پانی سے سر دھونے سے بھی سر کی کھال کو بہت اچھا تقویہ فراہم ہوتا ہے۔

جن خواتین کے بال پتلے اور روکھے ہوں انہیں ہفتے میں دو بار ناریل کے گرم تیل سے سر کی مالش کرنی چاہیے اور مالش کے بعد یا تو گرم تولیہ سر پر لپیٹیں یا گرم پانی سے بھرے ہوئے برتن میں سے اٹھتی ہوئی بھاپ بالوں کو دیں۔ بجھی رنگت والے بالوں کو چمک دار سیاہ کرنے کے لیے آملہ بہت مفید ہے۔ اس کے استعمال کا طریقہ یہ ہے کہ لوہے کے کھرل میں آملہ پانی کے ساتھ آدھ گھنٹہ تک ابال لیں اور اس سیال کو شیمپو کرنے سے ایک گھنٹہ پہلے سر پر لگائیں۔ اگر بال خشک ہوں تو شیمپو کرنے سے ایک گھنٹہ پہلے انڈے کا لیپ کریں۔ اس سے بال گھنے بھی ہوجائیں گے اور آخر میں دھونے کے لیے شہد کا پانی استعمال کریں۔

تیل سے مالش کرنے کے باوجود بال گرنے کی شکایت میں بھی ناریل یا زیتون کے گرم تیل سے ہلکی مالش کارگر ہوگی۔ یاد رکھیں کہ بہت زور سے بالوں کو رگڑنے سے بھی ان کے گرنے اور اکھڑنے کا خطرہ رہتا ہے۔ جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ سر کی جلد کے لیے مفید کوئی ٹانک اس حالت میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی جسم کے نظام ہضم پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں سبزیوں اور پھلوں پر انحصار کرنا ہوگا اور بادی چیزوں سے پرہیز سے بھی فائدہ پہنچے گا۔ متوازن غذا اور اس کے ساتھ اچھے ٹانک کے استعمال سے مثبت نتائج سامنے آئیں گے۔ اندرونی کمزوری کی صورت میں ڈاکٹر کے مشورے سے مناسب وٹامن یا ہیلتھ ٹانک لیا جاسکتا ہے۔ ہفتے میں ایک بار جڑی بوٹیوں سے تیار کیے ہوئے شیمپو اور حنا کے استعمال سے بالوں کو مزید تقویت ملے گی۔

ضرورت رشتہ

* مغربی یوپی کے اعلیٰ طبقے کے متمول خاندان کے تیس سالہ ایڈوکیٹ کے لیے خوبصورت ترجیحاً پروفیشنل لڑکی سے رشتہ مطلوب ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس ۲۸۳

* تجارت پیشہ سنی خاندان کے اکلوتے خوبرو اور دراز قد ایم کام لڑکے (عمر ۲۷ سال، قد ۱۸۰ سینٹی میٹر) کنونٹ کی تعلیم یافتہ حد درجہ خوبصورت لڑکی سے رشتہ درکار ہے۔

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس۔ ۲۸۴

* بیرونی جہاز راں کمپنی میں ماہانہ تیس ہزار روپیہ تنخواہ پانے والے سنی پٹھان لڑکے (عمر ۲۹ سال، قد ساڑھے پانچ فٹ) کے لیے موزوں رشتہ مطلوب ہے۔

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس ۲۸۵

* اعلیٰ تعلیم یافتہ سنی خاندان کے بی ای الیکٹریکل انجینیرنگ لڑکے (عمر ۲۷ سال، قد ۱۷۱ سینٹی میٹر) کے لیے رشتہ درکار ہے۔

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس۔ ۲۸۶

* ریلوے میں کلاس I افسر سول انجینئر (عمر ۲۷ سال قد چھ فٹ) کے لیے ترجیحاً سید سنی خاندان کی حد درجہ خوبصورت مذہبی رجحان رکھنے والی چھریرے بدن کی ۵ فٹ ۳ انچ سے زیادہ قد کی لڑکی سے رشتہ مطلوب ہے۔

ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس۔ ۲۸۷

* مہذب سنی خاندان کے صاحب تجارت و جائداد پبلک اسکول کے تعلیم یافتہ پی جی ڈی بی ام، کامیاب ایڈورٹائزنگ بزنس والے لڑکے (عمر ۲۸ سال قد چھ فٹ) کے لیے دراز قد، خوبصورت ترجیحاً پروفیشنل کیریر اختیار کرنے کے قابل مہذب خاندان کی لڑکی سے رشتہ درکار ہے۔ بشرط واپسی لڑکی کا فوٹو بھی ارسال فرمائیں۔

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس۔ ۲۸۸

* یوپی کے دیہی زراعت پیشہ خاندان بی ایس سی بی ایڈ ٹی جی ٹی میتھس لڑکے (عمر ۲۷ سال قد ۵ فٹ آٹھ انچ) کے لیے جس کی آمدنی آٹھ ہزار روپے ہے اور جس نے بی پی سی ایس کے امتحان میں شرکت کی ہے موزوں رشتہ مطلوب ہے۔ ذات برادری کی تفریق میں یقین رکھنے والے حضرات رجوع کرنے کی زحمت نہ فرمائیں۔

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس۔ ۲۸۹

* سعودی عرب میں برسر ملازمت پی ایچ ڈی ڈگری یافتہ لڑکے (عمر ۳۷ سال قد ۱۸۰ سینٹی میٹر) کے لیے جو عقد ثانی کا خواہاں ہے موزوں رشتہ درکار ہے۔ خواہش مند حضرات جلد رابطہ کریں۔ رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس۔ ۲۹۰

* مغربی یوپی کے سنی شیخ فاروقی خاندان کے دہلی پولیس میں سب انسپکٹر لڑکے (عمر ۲۶ سال، قد ۱۷۶ سینٹی میٹر، تنخواہ پانچ ہزار روپے ماہوار) کے لیے بینک میں ملازم یا ٹیچر لڑکی سے رشتہ درکار ہے

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس۔ ۲۹۱

* باعزت، شیخ خاندان کے تعلیم یافتہ اور متحرک لڑکے (عمر ۲۷ سال، قد ۵ فٹ ۹ انچ) کے لیے جو دہلی کی ایک معروف ایرلائنز میں ملازم ہے تعلیم یافتہ خوبصورت اور مذہبی رجحان رکھنے والی لڑکی سے رشتہ مطلوب ہے۔

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس۔ ۲۹۲

* ابوظبی میں ایگزیکٹو ۵۰ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ پانے والے سنی سید لڑکے (عمر ۲۶ سال، قد ۱۶۲ سینٹی میٹر) خوبصورت کنونٹ کی پڑھی ہوئی گریجویٹ لڑکی سے رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکا فیملی ویزا کا استحقاق رکھتا ہے۔

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس۔ ۲۹۳

* تجارت پیشہ سنی خاندان کے خوبرو دراز قد بی کام ایم بی اے (بمبئی) لڑکے (عمر ۲۶ سال، قد ۱۷۶ سینٹی میٹر) کے لیے حد درجہ خوبصورت تعلیم یافتہ روشن خیال اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والی لڑکی سے رشتہ درکار ہے۔ تفصیل کے ساتھ بشرط واپسی تصویر بھی روانہ فرمائیں۔

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس۔ ۲۹۴

* سنی خاندان۔ باہر سے حال ہی میں واپس آنے والے اور ہندوستان میں سکونت اختیار کرنے کا ارادہ رکھنے والے پوسٹ گریجویٹ لڑکے (عمر ۲۸ سال) کے لیے تعلیم یافتہ گھریلو اور خوبصورت لڑکی سے رشتہ مطلوب ہے۔

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس۔ ۲۹۵

* یوپی کے سنی خاندان کے ایک مشہور کمپنی میں ایگزیکٹو ایم ایس سی لڑکے (عمر ۲۵ سال، قد ۱۷۲ سینٹی میٹر) کے لیے گھریلو اور خوبصورت لڑکی سے رشتہ درکار ہے۔

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس ۲۹۶

* بمبئی میں مقیم معزز سنی خاندان کے اکلوتے لڑکے ایم ایس (سرجری) ڈاکٹر (عمر ۲۹ سال قد چھ فٹ ایک انچ) کے لیے جس کی ذاتی جائداد ہے اور جو اپنی پریکٹس شروع کرنے

* سنی انصاری خاندان کے گریجویٹ لڑکے (عمر ۲۷ سال، قد ۵ فٹ ۲ انچ) کے لیے جس کے ذاتی بزنس سے آٹھ سے دس ہزار روپے ماہانہ کی آمدنی ہے قبول صورت، دیندار تعلیم یافتہ لڑکی سے رشتہ مطلوب ہے۔ جہیز اور برادری کی کوئی قید نہیں۔ بہار اور مشرقی یوپی کے رشتوں کو ترجیح دی جائے گی۔

پتہ۔ شکیل اختر۔ (رابطہ۔ پی سی او) F/14/10 نفیس روڈ۔ جوگابائی ایکسٹنشن۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۲۵

یوں ازدواجی زندگی کی نعمتوں پر سماجی لعنتوں کا غلاف مت چڑھائیے

انسانی رشتوں کی پامالی کے دروازے چوپٹ کھولنے کا ذمہ دار کون ہے؟

اللہ عزوجل نے انسان کو مرد اور عورت کی صورت میں پیدا کیا تو اس کے پیچھے مقصد یہی تھا کہ نسل انسانی کا سلسلہ برقرار رہے اور یہ معمورہ عالم اس کے بندوں سے آباد رہے۔ اس کے لیے نہ صرف یہ کہ دونوں جنسوں کے درمیان ایک دوسرے کے تئیں کشش کا مادہ پیدا کیا بلکہ اس کشش کے نتیجے میں ان کے اتصال و ملاپ کے ضابطے بھی اپنے رسول کے ذریعے بھیجی گئی شریعت میں ہمیں بتائے۔ گویا کہ ایک حیوانی جبلت کو اعتدال و تہذیب کے زیور سے آراستہ کرکے مشیت ایزدی نے انسان کی افزائش نسل کا کام لیا۔ انسان ایک طرف اللہ کی اس حکمت اور مصلحت پر غور کرے جس کے تحت مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے لئے مودت و رحمت کا ذریعہ بنایا اور دوسری طرف اپنے بعض ان اعمال کا احتساب کرے کہ جن کی وجہ سے مودت و رحمت کے دروازے وہ اپنے اوپر بند کرلیتا ہے۔ اور یہ نہیں سوچتا کہ یہی داعیہ اسے زندگی کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا سلیقہ و شعور عطا کرتا ہے۔ اپنے علاوہ دوسروں کے لیے بھی کچھ کرنے کا جذبہ اس میں پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ صرف اپنے جسمانی تقاضے تو حیوان اور چرند و پرند بھی پورے کرلیتے ہیں۔ اس نے اشرف المخلوقات ہوکر بھی یہی کیا تو اس کے اس منصب پر فائز ہونے کا کیا فائدہ نکلا۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی طرف علماء و صلحاء بہتر سے بہتر پیرائے میں ہر دور میں لوگوں کو متوجہ کرتے رہے ہیں پھر بھی معاشرتی یا روحانی نظام کے تابع ہونے کو اپنے لئے باعث تحقیر سمجھتے ہیں اور ایسی باتوں میں اپنے لئے دل بستگی کا سامان ڈھونڈتے ہیں جن کی وقتی لذت و کشش انہیں خیرہ اور عقل و ہوش سے بیگانہ کردیتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کی زندگی کو کھوکھلا بھی کرتی رہتی ہے۔ اور یہی وہ باتیں ہیں جو ازدواجی زندگی کو نعمت کے بجائے لعنت و اضطراب اور جہنم کا نمونہ بنادیتی ہیں۔

> موجودہ دور میں زوجین کے مابین افتراق اور طلاق واقع ہونے کے اسباب کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پہلے کے مقابلے میں طلاق کے واقعات کی شرح خاصی بڑھی ہوئی ہے۔ کیا اس کے لئے زوجین ذمہ دار ہیں یا اس معاشرہ کا قصور ہے جس کے وہ افراد ہیں۔

موجودہ دور میں زوجین کے مابین افتراق اور طلاق واقع ہونے کے اسباب کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پہلے کے مقابلے میں طلاق کے واقعات کی شرح خاصی بڑھی ہوئی ہے۔ کیا اس کے لئے صرف زوجین ذمہ دار ہیں یا جس خاندان میں وہ رہتے ہیں یا یہ اس معاشرہ کا قصور ہے جس کے وہ افراد ہیں۔ اس سوال پر کئی پہلوؤں سے غور کیا جاسکتا ہے۔ اور بہرحال ہر پہلو کا کچھ نہ کچھ تعلق جدید معاشرے سے ضرور ہے۔

دنیا جب سے ایک ایسی بڑی اکائی کی صورت اختیار کرگئی ہے کہ جس کے ایک کونے میں کوئی واقعہ رونما ہوتو اس کی لہر دوسرے کونے میں ضرور محسوس کی جاتی ہے انسانوں کی ضرورتوں میں بھی ہر جگہ بتدریج اضافہ ہوا ہے۔ پہلے جب زندگی بہت سادی تھی تو آدمی کی بنیادی ضرورتیں روٹی کپڑا اور مکان تھا۔ بعد کے زمانوں میں اس میں ترجیحات شامل ہوگئیں یعنی یہ کہ چیزیں کس معیار کی ہونی چاہئیں۔ جیسے جیسے انسانی خواہشات کا دامن وسیع ہونے لگا۔ ایک طرف خواہشات بڑھنے لگیں تو دوسری طرف زندگی کے مسائل بڑھنے لگے جس سے ذہنی سطح پر ایک تصادم کی صورت پیدا ہوگئی وہ افراد جو مسائل زندگی کو حل کرنے کے مطلوبہ وسائل نہیں رکھتے یا اس سے کم کے حامل ہیں تو انہوں نے وافر وسائل کی فراہمی کے لئے تگ و دو کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کی۔ بعض دوسرے لوگ جنہیں اپنے اندر مسائل حیات سے نبرد آزما ہونے کی ہمت نہیں نظر آتی انہیں سکون کی تلاش ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ ہوتا آیا ہے لوگوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے والا ایک طبقہ ہر معاشرے میں موجود ہوتا ہے۔ سکون کے متلاشی افراد کو شراب اور دیگر منشیات کی شکل میں اپنی پریشانیوں کا مداوا مل جاتا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر کوئی شوہر نشے کا عادی ہے تو ایک عرصے تک تو وہ بیوی کی نصیحت اور اس کی دہائیوں کو سنتا رہتا ہے، طرح طرح کے بہانے بنا کر بیوی سے یا گھر کے دوسرے افراد سے پیسے لیتا رہتا ہے اور اپنی لت پوری کرتا ہے۔ جب اس کے مطالبات پورے نہیں ہوتے تو بیوی کو زدوکوب کرتا ہے۔ گھر کا سکون برباد ہوتا ہے۔ اگر چھوٹے بچے ہیں تو ان کی نفسیات میں ایک طرح کا خوف گھر کرلیتا ہے اور آئندہ وہ بھی باپ کے

> یہ وہ شئے ہے جو انسان کی آنکھ پر ایسا پردہ ڈال دیتی ہے کہ وہ انسانی رشتوں کے احترام کا احساس بھی کھو بیٹھتا ہے۔ کیا اس کی تصدیق ہمارے ہی اخبارات میں شائع ہونے والی ان خبروں سے نہیں ہوتی جن میں باپ کے ہاتھوں بیٹی کی ناموس لٹنے کے ان شرمناک واقعات کی تفصیل میں جانے سے قلم رکتا ہے۔ اس صلائے عام سے انسانی رشتوں کی پامالی کے دروازے چوپٹ کھولنے کا ذمہ دار کون ہے؟ اس ملک کی حکومت یا اس کے عوام؟

باقی صفحہ ۱۵ پر

بسم اللہ کی جگہ ۷۸۶ اور الحمد للہ کی جگہ ۱۱۰ کی گنتی لکھنا بدعت ہے

آپ کے سوال اور ان کے فقہی جواب

سوال :۔ کیا یہ صحیح ہے کہ اسلام ایک عام اصول کے طور پر انشورنس پالیسی لینے سے منع کرتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو آج کے دور میں جب چوریوں اور کار کے حادثوں کا ہونا عام سی بات ہے مسلمان خود کو ان کے مہلک اثرات سے کیسے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟

جواب:۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو انشورنس پالیسی لینے کی اجازت نہیں ہے تو اس کا اطلاق دارالاسلام پر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انشورنس پالیسیاں ایسے عوامل کو نظر میں رکھ کر وضع کی جاتی ہیں جن کے بارے میں پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی اور اس تصور کی بنیاد پر کیا جانے والا کوئی بھی لین دین اسلام میں ممنوع ہے۔ جہاں تک کار کا تعلق ہے تو اس کا انشورنس کرائے بغیر کار کو رکھنا اور چلانا ممکن نہیں ہوتا۔ لہذا ایسی صورت میں کار کے انشورنس سے بچا نہیں جاسکتا۔ اگر کوئی شخص ایسے ملک میں رہتا ہے جو دارالاسلام نہ ہو تو ہر معاملے میں اسے فیصلہ کرنے کی آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ اس لئے کسی غیر اسلامی ملک میں مقیم شخص کسی چیز پر انشورنس پالیسی لے سکتا ہے سوائے لائف انشورنس کے کیونکہ دیگر اقسام کے بیموں میں سودی لین دین کا دخل نہیں ہوتا۔

سوال :۔ کیا آپ کے خیال میں تبلیغی جماعت میں وقت لگانا مناسب ہے۔ یہ سوال اس بنا پر پوچھا جارہا ہے کہ اگرچہ بعض بدعات بھی وہ کرتے ہیں لیکن اللہ کی راہ میں مفید کام بھی کرتے ہیں۔ (ر۔ا۔ گلاسکو)

جواب :۔ محترم! کسی ثبوت کے بغیر یہ کہنا کہاں تک حق بجانب ہے کہ تبلیغی جماعت کے لوگ بدعات کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ ہمیں کسی فرد یا جماعت کے کاموں کے مثبت پہلوؤں کا ضرور اعتراف کرنا چاہئے۔ اگر اس کی کسی بات سے اختلاف ہو تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں اسے پرکھ کر جو خامی نظر آئے اس کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی جائے۔ اس خامی کو بدعت کا نام دینا درست نہ ہوگا۔ جہاں تک تبلیغی جماعت میں وقت لگانے کا سوال ہے تو اگر آپ کے پاس وقت ہے تو ضرور لگائیے اس میں اعتراض کی گنجائش نہیں۔

سوال :۔ کیا بسم اللہ کے لئے ۷۸۶ اور الحمد للہ کے لئے ۱۱۰ کی گنتی لکھنا بدعت ہے؟

جواب :۔ جی ہاں ایسا کرنا بدعت ہے۔

> بعض یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ سے بعض سورتیں تلاوت کرنے کی فرمائش کی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "الم" کی تلاوت فرمائی تو انہوں نے فوراً ان حروف کو ہندسوں میں تبدیل کرکے ان سے کوئی مطلب اخذ کرلیا۔ اس طرح حروف والفاظ کو ہندسی قدر میں ظاہر کرنے کی بنیاد یہودیوں نے ڈالی مثلاً الف کے لئے ایک اور ب کے لئے دو اور اسی طرح آگے کی گنتیاں۔ یہ طریقہ غیر اسلامی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب مسلم علماء قرآن کی بعض سورتوں مثلاً "الم" کے ابتدائی الفاظ پر بحث کررہے تھے تو بعض یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ سے بعض سورتیں تلاوت کرنے کی فرمائش کی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "الم" کی تلاوت فرمائی تو انہوں نے فوراً ان حروف کو ہندسوں میں تبدیل کرکے ان سے کوئی مطلب اخذ کرلیا۔ اس طرح حروف و الفاظ کو ہندسی قدر میں ظاہر کرنے کی بنیاد یہودیوں نے ڈالی مثلاً الف کے لئے ایک اور ب کے لئے دو اور اسی طرح آگے کی گنتیاں۔ یہ طریقہ غیر اسلامی ہے۔ بسم اللہ لکھنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ پورے الفاظ میں لکھا جائے اس سے عربی سمجھنے اور لکھنے کی صلاحیت رکھنے والوں کے لئے پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔

سوال :۔ کیا قرآن شریف کو کھولتے اور بند کرتے وقت اسے بوسہ دینا بدعت ہے؟

جواب :۔ نہیں اس میں بدعت کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ امام النووی سے منقول ہے کہ جب عکرمہ کی نظر قرآن کریم پر پڑتی تھی تو وہ اسے سر پر رکھتے تھے اور بڑے احترام کے ساتھ بوسہ دیتے تھے اور ساتھ ہی یہ کہتے جاتے تھے کہ یہ اللہ کا کلام ہے، یہ اللہ کا کلام ہے۔ اس بنیاد پر علامہ سیوطی نے خانہ کعبہ کے حجر اسود کی مثال پر قرآن کو بوسہ دینا احسن قرار دیا ہے۔ کیونکہ دونوں ہی اللہ کی طرف سے نازل کیے ہوئے انعامات ہیں۔ جس طرح ہم اپنے بچوں کے ساتھ شفقت برت کر اور انہیں بوسہ دے کر ان سے اپنے قلبی لگاؤ کا اظہار کرتے ہیں، یہی لگاؤ اور انسیت قرآن کو بوسہ دے کر ہم اللہ کے تئیں ظاہر کرتے ہیں۔

سوال :۔ کیا بغیر وضو کی حالت میں قرآن کریم کی تلاوت نہیں کی جاسکتی؟ ایسے شخص کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو کسی عارضے کی بناء پر وضو باقی نہ رکھ سکتا ہو؟

جواب :۔ تلاوت قرآن کریم کی مختلف حالتیں ہوسکتی ہیں۔ اگر عبادت کے ایک جز کے طور پر تلاوت کی جائے گی تو ظاہر ہے کہ اس کے لئے پوری طرح پاکی و طہارت کی ضرورت ہے کہ انسان باوضو رہے پاک صاف کپڑے پہنے ہو اور صاف ستھری جگہ پر قبلہ رو بیٹھا ہو۔ اگر حفظ کی غرض سے یا کسی حوالے کے لیے قرآن کی کوئی آیت یا سورت پڑھی جائے تو اس کے بارے میں علماء میں اختلاف رائے ہے۔ ایک گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب اس قول کو بنیاد

باقی صفحہ ۱۵ پر

اب آپ ٹرین میں بیٹھ کر ہوائی جہاز کی رفتار کا مزا لے سکتے ہیں

ایک مقناطیسی ٹرین آپ کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار کھڑی ہے

مستقبل کی ریلوے ٹیکنولوجی کے نام سے معروف میگنیٹک لویٹیشن ٹرین کے سامنے نئی ٹیکنولوجی کی صورت میں ایک ایسا حریف آنے والا ہے جسے سرافیم کہتے ہیں یعنی کہ سیگمنٹڈ نیز ڈانڈکشن موٹر یہ ۱۹۸۰ کی دہائی میں امریکہ کے اسٹار وار دفاعی پروگرام کی ٹیکنولوجی سے اخذ کیا گیا ہے۔ مقناطیسی ٹیکنولوجی جو سٹار وار سپر گن سے مدار میں آواز سے بیس گنا رفتار سے سٹیلائٹ داغنے کے لیے ڈیزائن کی گئی تھی اب اس کا استعمال تیز رفتار سرافیم کو حرکت میں رکھنے کے لیے کیا جائے گا۔

مقناطیسی ریلیں جو امریکہ، برطانیہ، جاپان اور جرمنی میں بن رہی ہیں۔ مقناطیسی انجذاب کے اصول پر پٹری سے اوپر ہو کر چلتی ہیں اور اسٹیل کی پٹری کو نہیں چھوتیں۔ اس وقت جس طرح کی گاڑیاں تیاری کے مراحل میں ہیں ان کی رفتار تو ۴۸۳ کلو میٹر ہوگی لیکن ان کے لیے خاص پٹری درکار ہوگی۔ اس کے برعکس سرافیم کے لیے انہی پٹریوں کو استعمال میں لایا جاسکے گا مگر اس کی رفتار ۳۲۲ کلومیٹر فی گھنٹہ سے زیادہ نہیں ہوسکے گی۔ نیو میکسیکو، امریکہ کی سنڈیا لیبارٹری میں اس پروجیکٹ پر کام کرنے والی ایک ٹیم کے مطابق سرافیم پروجیکٹ کی لاگت مقناطیسی انجذاب کے سسٹم والی ٹرینوں کے مقابلے میں چوتھائی آئے گی۔ اس سسٹم میں الیکٹرو میگنیٹک کوائلوں کے بجائے پٹریوں میں میگنیٹک فیلڈ کے ساتھ سیگمنٹڈ المونیم ریل کا استعمال کیا جارہا ہے اور یہ اسٹار وار کے "کوائل گن" کے اصول پر کام کرے گی۔ کوائل گن کے ذریعے Projectile الیکٹرو میگنیٹک کوائلوں کو ترتیب سے لگا کر ہزاروں میل کی دوری پر داغا جاسکتا ہے۔ اس گاڑی میں بیرل اور Shell کے کام کو ریورس کرنے کا بھی اہتمام ہے۔ جیسے ہی مقناطیسی کوائل آگے بڑھتی ہوئی ٹرین کے نیچے اس کے ایک جانب لگی ہوئی دھات کی پلیٹ کے مرکزی نقطہ سے گذرتا ہے مقناطیس سنسر کے ذریعے حرکت میں آتا ہے۔ یہ مقناطیس پٹری کے قریب یا اس سے سلسلہ وار نصب المونیم پلیٹوں میں برقی رو پیدا کرتے ہیں اور یہی برقی رو خود اپنی مقناطیسی فیلڈ بناتی ہیں جو گاڑی کی پیدا کی ہوئی مقناطیسی قوت کے مخالف ہوتی ہیں۔ مذکورہ پلیٹیں سیڑھی نما خانوں کی صورت میں پہلے سے اسمبل کی جاسکتی ہیں اور موجودہ ریل کی پٹریوں کے ساتھ جوڑی بھی جاسکتی ہیں۔ میگنیٹک فیلڈ کے سنیشن سرافیم میں پہیے کا استعمال ہوگا اور یہ پہیے فولاد یا مختلف ملی جلی دھاتوں کے بنے ہوں گے۔ سرافیم میں بروئے کار لائے گئے اصولوں ہی پر ایک ٹرین امریکہ کے ڈلاس ہوائی اڈے پر زیر استعمال ہے اور ابھی تک یہ گاڑی کامیابی سے ۲۲۳ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چل سکی ہے۔ رفتار کو تو بڑھایا بھی جاسکتا ہے لیکن پٹری کی سلامتی کی ضمانت اس صورت میں نہیں دی جاسکتی۔

☆ تین سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی ٹرین

اگر مستقبل قریب میں سرافیم ریلوں کا تجربہ کامیاب ہوگیا اور ایسی گاڑیاں عام طور پر چلنے لگیں تو ہم میں سے بہت سے افراد سکھ کا سانس لیں گے کہ چلو ہوائی سفر کے خطرات ٹلے اور کچھ نہیں تو دو گنے وقت میں انتہائی فاصلے طے کرلیں گے جتنا ہوائی جہاز سے طے کرتے۔ اور اسی طرح کی گاڑیاں ہمیں ان ہجوم اور دھکا پیل سے بھی نجات دے دیں گی جو ان دنوں ہوائی اڈوں اور ریزرویشن آفسوں میں نظر آتا ہے۔ ایک مشکل یہ ہے کہ جاپان، فرانس اور بعض یوروپی ممالک میں تو اتنی رفتار سے گاڑیاں چل رہی ہیں لیکن ان کے سوا دوسرے ممالک میں رفتار کی اس سطح کو چھونے کے خواب ابھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکے ہیں۔ جرمنی نے تو میگنیٹک سنیشن ٹرین کا پروجیکٹ ہی بند کردیا کیونکہ یہ بہت مہنگا پڑ رہا تھا کیونکہ اس میں پٹری کے دو فٹ اوپر سپر کنڈکشن کی تہہ لگانے میں فی کلومیٹر کئی ملین ڈالر کا خرچ تھا۔ اگرچہ سرافیم میں بھی مقابلتاً یہ خرچ کافی کم ہوجائے گا لیکن اس کی فی کلومیٹر لاگت دو لاکھ ڈالر آئے گی۔ پھر اس میں بعض تکنیکی مسائل ایسے ہیں جن کا ابھی کوئی حل سامنے آیا نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ کمپارٹمنٹوں کی ساونڈ پروفنگ اس میں از حد ضروری ہے کیونکہ جب مقناطیس کو آن یا آف کرتے ہیں تو بہت زیادہ شور پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ حد درجہ گرم ہوجانے والے مقناطیس کا ٹھنڈا کرنا بھی ایک مشکل کام ہے اور ابھی اس میں کامیابی حاصل ہونی باقی ہے اس میدان کے انجینئروں کو یقین ہے کہ ان مسائل کو حل کرلیں گے اور یہ کہ سرافیم میں سفر کو تیز تر اور سستا بنانے کی تمام صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔

اسٹیریو ٹیکنک ریڈیو سرجری یعنی بغیر آپریشن ٹیومر کا کامیاب علاج

اسٹیریو ٹیکنک ریڈیو سرجری نے اس تصور کو باطل کردیا ہے کہ دماغ چونکہ جسم کا کافی پیچیدہ عضو ہے اس پر Invasive سرجیکل تیکنکیں استعمال نہیں کی جاسکتیں۔ آج مذکورہ ٹیکنک ہر طرح کے ٹیومر رگوں کے فعل کی خرابی کو درست کرنے کے لیے بروئے کار لایا جارہا ہے اور اب اوپن سرجری کے ذریعہ بڑی کامیابی کے ساتھ ٹیومر نکال دیا جاتا ہے۔ جدید نیورو سرجری پوری طرح محفوظ سمجھی جاتی ہے تاہم عمر رسیدگی، ذیابیطس پر ڈھیلی گرفت، گذشتہ کئی بار کی سرجری، دماغ کے مرکزی حصے میں ٹیومر کی موجودگی، کسی ٹیومر کا ناکافی اخراج اور سرجری کے لیے ٹیومر کی ناموزونیت، اور زیادہ خون بہہ جانے کا خطرہ ایسے عوامل ہیں جو مریض کو

> عمر رسیدگی، ذیابیطس پر ڈھیلی گرفت، گذشتہ کئی بار کی سرجری، دماغ کے مرکزی حصے میں ٹیومر کی موجودگی، کسی ٹیومر کا ناکافی اخراج اور سرجری کے لئے ٹیومر کی ناموزونیت، اور زیادہ خون بہہ جانے کا خطرہ ایسے عوامل ہیں جو مریض کو اوپن سرجری کے لئے ناموزوں قرار دے دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں اسٹیریو ٹیکنک ریڈیو سرجری کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

اوپن سرجری کے لیے ناموزوں قرار دے دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں اسٹیریو ٹیکنک ریڈیو سرجری کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

ریڈیو سرجری جس کا آغاز ترقی یافتہ ممالک میں ۱۹۵۱ میں ہوا تھا اب ہندوستان میں بھی دستیاب ہے۔ اسٹیریو ٹیکنک میں بنیادی طور پر اس اصول پر کام کیا جاتا ہے کہ کسی نقطے کی نشاندہی مکمل پور پر اس صورت میں ہوسکتی ہے جب اس کا تعلق ایک دوسرے کے سامنے زاویہ قائمہ بناتے ہوئے تین مختلف محوروں سے اس کا تعلق دریافت کرلیا جائے۔ تیز رفتار گرافک کمپیوٹروں کی ایجاد کا ریڈیو ایکٹیوٹی کو بنانے میں بڑا ہاتھ ہے۔ نیورو امیجنگ اور اسٹیریو ٹیکنک آلات کی بھی اس میں بڑی اہمیت ہے جن کے ذریعے دماغ کے اندر سہ جہتی طور پر کسی جھلی وغیرہ کو دوسرے اسٹرکچر سے جوڑا جاسکتا ہے۔ مریض کی کھوپڑی پر فٹ کیا ہوا اسٹیریو ٹیکنک فریم مریض کے سر اور اخراج کے لیے مطلوب جھلی ٹیومر کی شبیہہ ابھارنے یعنی Reconstruct کرنے کے لیے ریفرنس پلیٹ فارم کا کام کرتا ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر دماغ کے اندر کے مرض زدہ علاقے پر ریڈی ایشن کی مخصوص خوراک پہنچاتے ہیں جس کے لیے Linear ایکسلیٹر کی مدد سے ایکسرے بیمس داخل کی جاتی ہیں۔ Linear Accelerator کی حد درجہ لچک داری ریڈی ایشن کا ایسا ہمہ جہت ماخذ فراہم کرتا ہے جو بغیر چھوئے ہوئے متعینہ جگہ پر لگتا ہے۔ اور دماغ کے پرہجوم نظام کو دیکھتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے Irradiation کا یہ طریقہ پوری طرح یقین دہانی کرادیتا ہے کہ آس پاس کی جگہ پر ریڈی ایشن کی مقدار قابل قبول حد کے اندر ہے یا نہیں۔ اس طریقے سے ٹیومر واقعی ضم نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے خلیے بے جان کیے جاتے ہیں۔ تاکہ اس کی آگے کی نشو و نما کو روکا جاسکے۔ بارہ سے اٹھارہ ماہ کے عرصے میں Irradiated. خلیے مرجاتے ہیں اور ٹیومر کے سائز میں کمی واقع ہونے لگتی ہے۔

روایتی ریڈیو تھراپی میں علاج کئی ہفتوں تک چلتا ہے اور ٹیومر کو موثر طور پر ختم کرنے کے لیے Radiation کی زیادہ مقادر بھی دی جاتی ہے لیکن چونکہ یہ کثیر مقدار دماغ سے ملے ہوئے حصوں کو متاثر کرتی ہے۔ حساس علاقوں کو محفوظ رکھنے کی غرض یہ مقدار کم کرنا ضروری ہے۔ پھر روایتی علاج کو زیادہ مدت پر پھیلانے کا مقصد یہ بھی ہے کہ متاثرہ خلیوں کو روبہ صحت ہونے کا وقت مل جائے۔ اسٹیریو ٹیکنک ریڈیو سرجری کا
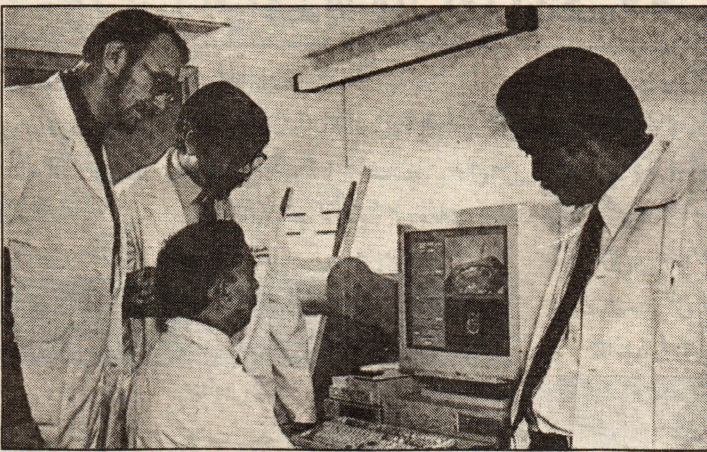
☆ ریڈیو سرجیکل ٹیم کمپیوٹر کے ذریعہ علاج میں مصروف

سب سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ اس میں Radiation کی خوارک صرف ایک بار دی جاتی ہے اور نقصان کا امکان یا تو برائے نام ہے یا بالکل نہیں ہے۔ اس میں صحت یابی کے لیے کوئی وقت درکار نہیں ہوتا اور جو طریقہ اس میں اختیار کیا جاتا ہے اس میں مریض کی موت واقع ہونے کا خطرہ بھی نہیں رہتا۔ سائڈ افیکٹ اور پیچیدگیوں سے یہ طریقہ تقریباً خالی ہے۔ اسی طرح نہ تلوث کا خطرہ ہے اور نہ آپریشن کے لیے مریض کو بیہوش کرنے کی نوبت آتی ہے، نہ ہی مریض کو غشی یا قے اور متلی کی شکایت ہوتی ہے۔ دوران علاج مریض کی ریڈیو اور آڈیو سسٹم کی مدد سے برابر نگہداشت جاری رہتی ہے۔ اسے صرف ایک رات کے لیے طبی نگرانی میں رکھا جاتا ہے جس کے بعد وہ علاج سے قبل کی سرگرمیوں میں پوری مستعدی سے مصروف ہوسکتا ہے۔

علاج کے بعد "فالواپ" کے طور پر چھٹے مہینے کیٹ اسکین اور ایم آر آئی ضرور کروانا پڑتا ہے یہ دیکھنے کے لیے کہ ٹیومر کا سائز چھوٹا ہوگیا ہے اور اس کی افزائش نہیں ہوئی ہے۔ اپولو کینسر اسپتال مدراس سے وابستہ ڈاکٹر کے گنگا پتی کے مطابق اب تک وہاں پینتالیس مریض اسٹیریو ٹیکنک ریڈیو سرجری اور بیس مریض اسٹیریو ٹیکنک ریڈیو تھراپی کرا چکے ہیں اور اس میں پیچیدگی کی شرح آٹھ فیصد رہی ہے جو مقبول عالمی شرح سے اوپر نہیں ہے۔ ہندوستان میں اس علاج پر آنے والی لاگت باہر کے مقابلے میں آٹھ گنا کم ہے۔

کیا مولانا علی میاں نے ندوہ کی تحریک کا رخ خانقاہیت کی طرف موڑ دیا ہے

ندوہ کی اسٹرائک اور مولانا علی میاں ومولانا عمران خان کے اختلاف پر یوں روشنی ڈالی گئی ہے

ملی ٹائمز میں تبصرے کے لئے دو نسخے آنا لازمی ہیں تبصرے کے لئے کتابوں کے انتخاب کا حتمی فیصلہ ادارہ کرے گا البتہ وصول ہونے والی کتابوں کا اندراج ان کالموں میں ضرور ہوگا۔

نام کتاب: حیات عمران
مصنف: مسعود الرحمن خاں ندوی
صفحات: ۲۹۰، قیمت: ایک سو پچاس روپے
ناشر: مکتبہ دین ودانش، بھوپال
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

حیات عمران، مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب مرحوم کی سوانح عمری ہے۔ مرحوم ندوی و تبلیغی حلقہ کی ایک مشہور شخصیت تھے۔ بھوپال میں عظیم سالانہ تبلیغی اجتماع کی بنا انہوں نے ہی ڈالی تھی۔ مدرسہ تاج المساجد کے بانی بھی آپ ہی تھے۔ آپ بھوپال کے ایک مشہور علمی خانوادے کے فرزند تھے اور علم و تبلیغ دونوں انہیں ورثے میں ملے تھے۔ اپنی تبلیغی خدمات کی وجہ سے ایک عالم میں جانے جاتے تھے اور آج بھی ملک کے ہر گوشے میں ان کے عقیدتمند موجود ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں ان کے بھتیجے اور داماد پروفیسر مسعود الرحمن خاں ندوی نے مولانا مرحوم کے حالات زندگی قلم بند کیے ہیں۔ حیات عمران، دراصل مولانا مرحوم کی سوانح حیات کا پہلا جز ہے جس میں ان کے خاندانی پس منظر پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا مرحوم کی پیدائش و پرورش اور تعلیم و تربیت سے بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

بالعموم یہ دیکھا گیا ہے کہ اردو کے سوانح نگار اپنے موضوع سے متعلق غیر تنقیدی رویہ اختیار کرتے ہیں اور اگر معاملہ کسی بزرگ و برتر علمی شخصیت کا ہو جس کے نام کے آگے پیچھے حضرت الاستاذ و مولانا اور رحمۃ اللہ تعالی جزء لازم کے طور پر ہمیشہ موجود ہوں، تو سوانح نگاروں کے اوصاف و کمالات اس طرح بیان کرتا ہے جیسے اس عظیم شخص کا تعلق اس قبیلہ انسانی سے ہو ہی نہیں جس کے سفر کی ابتدا ہی اس روئے زمین پر ایک گناہ لطیف سے ہوئی تھی۔ خوش قسمتی سے زیر تبصرہ کتاب کے مصنف نے اس قسم کے غلو سے احتراز کرتے ہوئے موضوع بحث شخصیت کو ایک ایسے انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے جو خوبیوں کے ساتھ بعض کمزوریاں بھی رکھتا تھا۔ اگر خاں صاحب مرحوم اور ان کے بعض بزرگوں کے اندر غصہ ازحد تھا تو مصنف نے ان کی شیریں مقالی اور قرآن سے قابل رشک شغف پر بے انتہا زور دیکر اسے دبانے کی سعی نہیں کی ہے۔ سچائی یہ ہے کہ مصنف نے مولانا مرحوم کو کشف و کرامات کی دبیز چادر میں لپیٹنے کے بجائے ایک ایسے انسان کی طرح پیش کیا ہے جسے خدا نے علمی و انتظامی صلاحیتوں سے خوب نوازا تھا انہیں اس نے مقدور بھر دین رحمت کی خدمت میں استعمال کیا۔

زیر تبصرہ کتاب میں خاں صاحب مرحوم اور مولانا علی میاں کے بعض امور پر اختلافات کا بھی تذکرہ ہے۔ مصنف نے اس موضوع پر ایسا محسوس ہوتا ہے، کافی ڈر کے قلم اٹھایا ہے اور کوشش کی ہے کہ اپنی طرف سے کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے طرفین کی آراء اور ان کے بعض معاصرین کے اقوال نقل کردیے جائیں

خاں صاحب مرحوم کا ندوہ سے تعلق والہانہ و عاشقانہ نظر آتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف وہاں تعلیم حاصل کی بلکہ موقع ملنے پر مختلف حیثیتوں میں اس کی حتی المقدور خدمت بھی کی۔ جب وہ ندوہ کے انتظام و اہتمام سے وابستہ تھے تو طلبہ کی ایک اسٹرائک ہوئی تھی جس کا رخ آخیر میں ان کی طرف موڑ دیا گیا تھا۔ اہل ندوہ بالعموم ان واقعات کے تذکرے سے گریز کرتے ہیں۔ اور جو تذکرے ملتے ہیں ان میں خاں صاحب مرحوم کی تصویر کچھ یوں پیش کی گئی ہے جیسے وہ کٹر قسم کے ضدی اور آمرانہ ذہنیت کے مالک تھے۔ اس کتاب کے

☆ مولانا علی میاں ندوی

مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اس عام رائے کے برعکس مولانا کافی مشفق مگر اصول کے پکے تھے۔ شفقت کا مادہ ان میں تھا مگر وہ کبھی ان کی اصول پسندی و انصاف دوستی پر غالب نہیں آتا تھا۔ ہمارے اداروں میں ایسے اشخاص بد قسمتی سے پسند نہیں کیے جاتے کیونکہ بالعموم لوگ سہل پسند ہوگئے ہیں اور اکثر بیجا مراعات کے تمنائی ہوتے ہیں۔

ہمارے مدارس ہمہ جہتی علمی مرکز ہونے کے بجائے بعض شخصیتوں کے فکر و مزاج کا پر تو بنتے جارہے ہیں جہاں اختلافات کو گوارا نہیں کیا جاتا، جہاں تیکھے سوالات کرنا بے ادبی اور ہنسنا ہنسانا بد ذوق قرار پاتی ہے جہاں مختلف کنوؤں سے پیاس بجھانے کی روش پر قد غنیں لگادی گئی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں خاں صاحب مرحوم اور مولانا علی میاں کے بعض امور پر اختلافات کا بھی تذکرہ ہے۔ مصنف نے اس موضوع پر ایسا محسوس ہوتا ہے، کافی ڈر کے قلم اٹھایا ہے اور کوشش کی ہے کہ اپنی طرف سے کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے طرفین کی آراء اور ان کے بعض معاصرین کے اقوال نقل کردیے جائیں اور نتیجہ اخذ کرنے کی ذمہ داری قاری پر چھوڑ دی جائے۔ یہ بات بعید از فہم ہے کہ کوئی ایسے اختلافی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہوئے خوف محسوس کرتا یا تذبذب کا شکار کیوں ہوتا ہے۔ کچھ لوگ غلط طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ اختلافات کے تذکروں سے کسی کی شخصیت مجروح ہوتی ہے یا کسی کی بزرگی پر حرف آتا ہے۔ ایسی سوچ کے حامل افراد دراصل کسی نہ کسی درجے میں شخصیت پرستی کے مرض میں مبتلا ہیں جو سراسر اسلام کی روح کے خلاف ہے۔

خانصاحب مرحوم اور مولانا علی میاں کے اختلافات کے تذکرہ کو پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موخر الذکر نے اصل تحریک ندوہ کا رخ اپنی طبیعت و مزاج کے مطابق خانقاہیت کی طرف موڑ دیا ہے۔ یہ کوئی خوش آئند بات نہیں ہے کہ ہمارے مدارس ہمہ جہتی علمی مرکز ہونے

باقی: صفحہ ۱۲ پر

آپ کی الجھنیں

بیوی کو اولاد نہ ہونے کا قصوروار ٹھہرانا غلط ہے

اگر آپ کسی الجھن میں ہیں یا کسی اہم مسئلے پر فیصلہ لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں جس سے آپ کی زندگی کا سکون درہم برہم ہوگیا ہے تو آپ فوری طور پر ہمیں اپنے مسائل سے آگاہ کریں۔ ہم اس کالم میں آپ کی نفسیاتی الجھنوں کو دور کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔

سوال :— مجھے شادی کیے ہوئے دس سال گذر گئے ہیں اور ان دس سالوں میں دو بچے بھی ہوئے ہیں اور میں گھر پر بہت کم قیام کرتا ہوں، میری پریشانی اور الجھن یہ ہے کہ میری بیوی اور بھائی بہنوں میں ہمیشہ نوک جھونک ہوجایا کرتی ہے۔ اگر میں اپنی بیوی کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں تو میری بیوی کہتی ہے کہ اپنے بھائیوں اور بہنوں کی مدد کرتے ہیں اور اگر میں بہنوں اور بھائیوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ لوگ کہتے ہیں کہ اپنی بیوی کی مدد کرتے ہیں۔ آپ بتائیے کہ میں اس صورت میں کیا کروں؟

جواب :— اس صورت میں آپ سے اظہار ہمدردی ہمارا اولین فرض ہے۔ معاملہ تو آپ نے خود ہی صاف کردیا ہے کہ نہ بیوی آپ کے سمجھانے سے مطمئن ہوتی ہے اور نہ آپ کے بھائی بہن آپ کو خاطر میں لاتے ہیں۔ ذمہ داری آپ کو سب کی نبھانی ہے بیوی کی بھی اور بھائی بہنوں کی بھی۔ آپ غالباً ملازمت یا تجارت کے سلسلے میں اکثر گھر سے باہر رہتے ہیں۔ اب آپ یہ کرسکتے ہیں خاندان کے سنجیدہ افراد کو بیچ میں ڈال کر اپنے گھریلو حالات اور مالی مسائل کے پیش نظر کوئی سبیل ایسی نکال لیں کہ ایک جگہ ساتھ رہ کر آپ کے بیوی بچے اور بھائی بہن گزارا کرلیں اور گھر سے دور رہ کر طرح طرح کی پریشانیاں برداشت کرکے آپ سب کی کفالت کررہے ہیں اس کا انہیں کچھ احساس ہوجائے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کے بھائی بہن ابھی عمر کے اس مرحلے میں ہوں کہ ان سے آپ کا الگ ہونا مناسب نہ رہے۔ جہاں تک آپ کے بیوی بچوں کا سوال ہے تو یہ بات کھلی ہوئی ہے کہ ان کی مدد تو آپ کو ہی کرنی ہے بشرطیکہ وہ حق پر ہوں۔

شوہر صاحب کو چاہیے کہ وہ اپنا بھی طبی معائنہ کروائیں

سوال :— میری لڑکی کی شادی بڑے بھائی کے لڑکے سے ہوئی تھی۔ بھائی کی زندگی میں ہر پریشانی کا حل ہوجایا کرتا تھا۔ اب چونکہ بھائی صاحب نہیں رہے اور گذشتہ دس سالوں سے لڑکی صبر و سکون سے زندگی گذار رہی ہے۔ البتہ پچھلے دو سال سے بے حد پریشان ہے۔ سسرال کے لوگوں میں انسیت اور محبت کی کمی ہے۔ شوہر کی توجہ عارضی ہے۔ ہمیشہ ناراضگی ظاہر کرتا ہے۔ وجہ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ لڑکی کی عمر زیادہ ہے۔ جب کہ عمر میں دو یا ڈھائی مہینہ کا فرق ہے۔ ساس اولاد کی خواہش مند تو ہے لیکن چھوچھا (دعا تعویز) کی طرف راغب ہے۔ موکل علم رکھنے والے عالم پر بھروسہ کیے ہوئے ہے۔ ایک سال گذر گیا لیکن اولاد نہ ہوئی (دس سال سے کوئی اولاد نہیں) چارو ناچار لڑکی کو اپنے گھر لاکر علاج کرایا۔ ڈاکٹروں کے مشورے پر عمل کیا۔ نسوانی مرض کافی بڑھ گیا تھا۔ اب ایک حد تک کمزوری باقی ہے۔ سسرالیوں کا مطالبہ ہے کہ لڑکی کو فوراً لاکر چھوڑ دو۔ ایسی حالت میں میں کیا کروں جبکہ سسرال میں علاج کی کوئی توقع نہیں۔

دس سال کیا ایسے کئی جوڑے ہمارے سامنے ہی ہیں جن کے یہاں تیرہ اور اٹھارہ سال میں اولاد ہوئی ہے اور انہوں نے صرف اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھا۔ نہ کسی اوجھا کی منت کی نہ ساس کے اعتقاد کے مطابق "اولاد دینے والے عالم" کے سامنے ماتھا ٹیکا۔

جواب :— لڑکی کی شادی سسرال والوں سے ہوئی تھی یا اس خاندان کے ایک ایسے فرد سے جس نے اللہ کی نازل کی ہوئی شریعت کے مطابق لڑکی کو اپنی زوجیت میں لے کر اس کی رو سے عائد ہونے والے حقوق کی ادائیگی کا عہد کیا تھا۔ خط کے سیاق سے ظاہر ہورہا ہے کہ شوہر صاحب تو عمر میں ڈھائی مہینے کے فرق کا شوشہ چھوڑ کر منظر سے غائب ہوگئے اور بیوی پر اپنے تمام مالکانہ حقوق اپنے گھر والوں کے نام منتقل کرکے بزعم خود دنیا اور آخرت دونوں میں سعادت مند بن گئے۔

ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس معاملہ سے متعلق افراد کا رویہ کسی علاقے اور گروہ میں رائج سماجی طور طریقوں اور رسموں سے تال میل تو کھا سکتا ہے لیکن شریعت کی نگاہ میں یہ حد درجہ مذموم اور ناپسندیدہ ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ جو ساس صاحبہ ایک سال سے موکل کا علم رکھنے والے عالم پر انحصار کیے ہوئے ہیں وہ خود کو خرابی میں تو مبتلا کرہی رہی ہیں کیونکہ اس چکر میں پڑنے والے لوگ اپنے ارادے اور فیصلے کی قوت کھو بیٹھتے ہیں، دوسری طرف وہ ایمان کے بنیادی رکن عقیدہ توحید کو بھی کمزور کررہی ہیں جس کے تحت ہمارا ایمان یہ ہے کہ اللہ جو ہمیں پیدا کرنے والا اور مارنے والا ہے اس کے سوا نہ ہمیں کوئی کچھ دے سکتا ہے اور نہ ہم سے کچھ چھین سکتا ہے۔ دس سال کیا ایسے کئی جوڑے ہمارے سامنے ہی ہیں جن کے یہاں تیرہ اور اٹھارہ سال میں اولاد ہوئی ہے اور انہوں نے صرف اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھا۔ نہ کسی اوجھا کی منت کی نہ ساس کے اعتقاد کے مطابق "اولاد دینے والے عالم" کے سامنے ماتھا ٹیکا۔ رہ گیا اولاد کے سلسلے میں انسانی تدابیر اور علاج معالجہ کا سوال تو جس طرح لڑکی والوں نے اسے اپنے گھر لاکر اس کا ڈاکٹری علاج کروایا ہے اسی طرح لڑکے والوں نے بھی اپنے صاحب زادے کی طرف توجہ کرتے ہوئے ان کا بھی چیک اپ کروالیا ہوتا۔ لیکن افسوس کہ عموماً ایسا ہوتا نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا سماجی رواج و رسوم کا جو جال بچھا ہوا ہے اس میں لڑکے

باقی: صفحہ ۱۲ پر

Vol. III No. 12

THE MILLI TIMES INTERNATIONAL

RNI # 57337/94 Reg. DL # 11234/96

16-30 JUNE, 1996

GUEST COLUMN
by Rashid Shaz

It is Important! No, it's meaningless!

With a steady decline in the number of Muslim parliamentarians more and more Muslims are now discovering the paradox of living in a post-secular era.

We Muslims are a hapless lot. We are told to believe that we are a minority, hence we cannot play a key role at the center stage of political drama, if there can be any role for us it can only be at the periphery. All that we can do is to support this non-Muslim group or that anti-Muslim political party. The rest is beyond our limits and imagination. This has been continuously told to us not only by our open enemies but more so by our own Ulema and intellectuals and by those puppeteers who somehow manage to enter the Parliament and thus proclaim themselves as our political leaders.

The number game which matters very much in the political arena rarely clicked when fitted with a Muslim political device. For example, in Bihar where Muslims constitute as much of the total population as do the Yadavas, no Muslim politician could think of tilting the balance in the Muslims' favour, or creating a situation in which the Ummah is in a position to be effective. In West Bengal the Muslim demography speaks of almost the same situation as in Kerala. Whereas Muslims in Bengal, despite a majestic history of Muslim Bengal, have accepted a life of political slavery under an oppressive communist regime; in Kerala, they have the guts to upset any political equilibrium. The Sikhs, relatively a small minority, can manoeuvre the political situation in such a way so as to force Mr. Vajpayee, the then Prime Minister, for a hurried trip to the Golden Temple. Organized as they are, the 1984 anti-Sikh roits will never be forgotten in Sikh history and the community will guard every moment to avoid any such tragedy in the future. We Muslims have a long history of anti-Muslim riots, of organised pogroms, of state terrorism. For the last 50 years we are living in a state of civil war. Hardly any day passes when the media does not report the loss of Muslim lives, the victimisation of helpless Muslim sisters and the unjustified arrests of Muslim youths on the pretext of terrorists or ISI agents. Then we have 6 December, the day of demolition, the day when Indian secularism was buried right under the debris of the Babri Masjid. Some say, another name of Ramlalla temple is the grave of secularism. I feel the Operation Demolition is still on. Deep down inside me something is being demolished, every moment. In fact, we have so much to count that if we mourn only the major tragedies of our secular history, our entire calendar will be a multi-black calendar.

In the Muslim press, there is a great deal of hoo-ha about the supposed 'Muslim representation' in the Indian parliament. Some of our secular 'friends' have also voiced their concern about this 'not very fair representation'. But are we really dumb enough to believe that the 23 MPs in the present parliament with a Muslim name really represent the Ummah of Islam? Do they have a Muslim agenda? Or can they themselves claim, even in their wildest dreams, to be our representatives? A Muslim representative is one who enjoys the confidence of the Muslim people, who works for the Islamic agenda. And the Islamic agenda is so clearly defined by Allah and His prophet that the community cannot easily be bluffed. How long will we go on believing that those who openly work for an un-Quranic agenda can be our representatives? We Muslims have not chosen them, nor have we given them the authority to represent us at any forum. In fact, they have been hand picked by their own masters. They are the nominees of *Mushrekeen*, the appointed agents of Kufr; in no way they can be called our representatives. Why then, is there so much hue and cry if their number has gone down. It's 'their' worry, not our concern.

Yes, there is a point which the secular magicians can hardly miss. The Muslim presence in the parliament and at positions of ceremonial importance keeps us in the illusion of power-sharing. The more the Muslim MPs and ministers, the stronger the illusion. But to their misery, this technique, which was quite capable of creating a web of illusions in the past is no more that effective. Today 'they' need more Muslim MPs and ministers to blind our vision. Ours is a secular country which does not look at people with a religious identity. Yet every regime will have some Muslim ministers of ceremonial importance and they will not miss any opportunity to appoint Muslim ambassadors to Muslim countries. Our secularism is only skin-deep, nay, it is a mask to wear whenever convenient.

Last month, when the Milli Parliament issued a Fatwa asking Muslims to stay away from the polls in the absence of a fourth Muslim option, we simply considered the electoral battle a meaningless game. A system which was forcing us to choose our representatives from among our three long-standing enemies, from among the three known evils was Islamically not acceptable to us. Then some of our learned Ulema and community leaders openly advocated to chose the lesser evil. But I simply wonder if faced with a situation to choose from rape, murder and sodomy which lesser evil shall I opt for? My understanding of the Qur'an and Sunnah compelled me to stay away from evils of all recognizable varieties. Evil begets evil. Once you're trapped in it you move on and on in a vicious circle. And what I said at that time was not a creation of my own imagination. The Holy Qur'an enjoins upon us, in explicit terms, not to make disbelievers in-charge of our own affairs. A disbeliever, by no cannon of Muslim judgement can be our messiah, our guide or leader. Such is Allah's verdict and nobody can alter or dare question His judgement.

Yet in the English press there were some articles by Muslims of the secular variety, questioning God's wisdom. Some questioned the Milli Parliament's right to issue a fatwa, to indulge in such religious adventurism. Well, a fatwa is a religious judgement usually issued by the chief mufti of the *Khilafah* (Islamic State). In the Islamic state a fatwa is a legislation issued to enforce, to get enacted. We Muslims do not have political power to enforce our fatwa. For the last 72 years we are living without a Khalifah. Nevertheless, we all share the dream of restoring the world Khilafah. Though our fatwa may not be that effective today, we have not shed our dreams, we have not put aside the Qur'an and Sunnah. Our fatwa, at this stage, is not a legislation, rather it is a religious opinion. It is the most precise way to tell the Ummah how Allah and His prophet want us to behave in a given situation.

The Milli Fatwa, some argued, would undermine Muslim importance in politics. Some feared such "obnoxious" fatwas would further minimize Muslim presence in the corridors of power. In the present elections many noted Muslim politicians lost their seats. They were no more acceptable to Muslims. Their long-standing un-Islamic commitments were exposed and the Muslims could see them through and through. Some, however managed to bluff the community, hiding their true identity, their aspirations and agenda. Yet some were clever enough to create communal tension during the election to polarize Muslim votes in their favor, indulging in 'Islam in danger' kind of manoeuvering. In their mad hatred for non-Muslim population the poor Muslims were so blinded that they voted en masse for 'their' boys. Idiots.

Despite so much success to their credit the secular magicians of today know well that the fallacy of Muslim participation or power-sharing is a dying myth. The new generation of Muslim Indians have discovered that every political party has its own Sikander Bakhts. And if the BJP's 'sweet' Sikander Bakht is not supposed to represent Muslim aspirations how the Sikander Bakhts of other political parties can claim to be our representatives? By delegating any authority to their own trusted men or entrusting a ministerial portfolio to their own Bakhts, power is not shared. rather it is taken, this time in the name of Muslims.

The author is the Leader of the Milli Parliament and Chairman of the Institute of Muslim Ummah Affairs.

The new hero in Israel

Today, Muslims are an oppressed but silent lot. Whither goest the Muslim pride? asks *Raheel Ahmed*

The poll results in Palestine/Israel have finally ascertained that for a dominant majority of the Jewish people the martyr-hero is Yaghal Amir and not Yitzhak Rabin. Mr. Netayanhu's entire election campaign was based on Arab baiting which subsequently enabled him to win the elections. This is however not to suggest that his rival Shimon Peres is an Arab rooter or an Islamic buff, he is at least polite enough to offer some sort of 'peace'. On the other hand Netayanhu is bent upon severing all such moves and establishing new Jewish settlements in the West Bank.
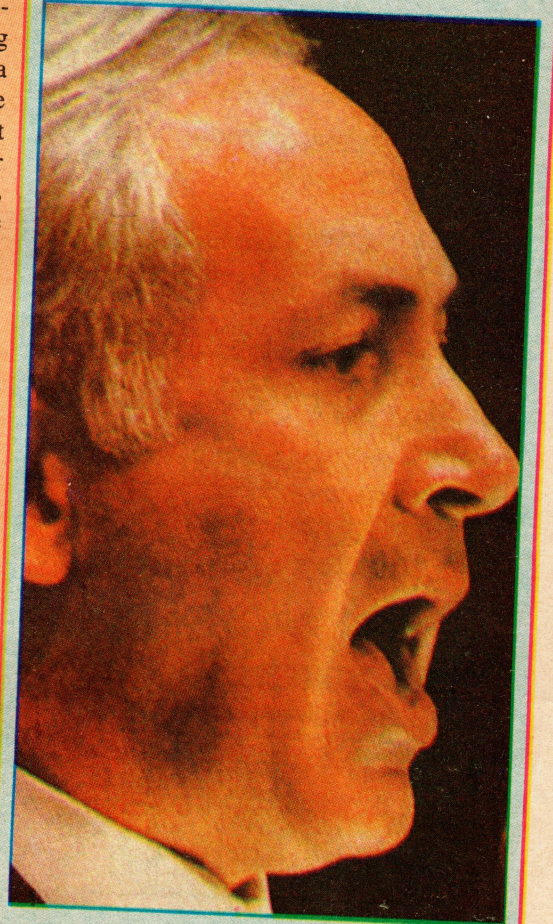
Notwithstanding this blatant show of the Israeli support to the terrorist activities against Muslims, what is more disturbing is our own silent reproach of the efforts for the creation of a just society based on Islamic principles. The western media, which turns a blind eye to the ever-increasing Jewish militancy, loses no opportunity to tell us that their militancy is an individual aberration, local phenomenon but our counter-attack poses great threat to the 'civilized world'. When a helpless Muslim child throws stones on the oppressors it is reported as an act of terrorism but when an Israeli man massacres hordes of innocent Muslims in the Haram Ibraheem, it is simply dismissed as an individual act of a lunatic. In the Jewish world the assassin of Rabin becomes a national hero and a dominant majority of the Jewish people vote for his aspiration while our heroes are declared as terrorist. A blind Muslim scholar in the United States is held in prison for many years. Projected as the chief-ideologue of "Islamic Terrorism" in the modern world, the old man aspires to establish a world Khilafah on the ruins of modern-day spiritually bankrupt civilization. He is in fact our man, our hero. It is time to realise that their terrorist is actually our hero, a faithful servant of Islam.